[illegible]hboo ki Mout

زیر نظر افسانوی مجموعہ ''خوشبو کی موت [illegible] پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ ہر افسانے کے آغاز میں ایک خوبصور[illegible] افسانے کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔............ جناب شہزادہ بسمل [illegible] ہے جو ہر سطر کے ساتھ پرت پرت کھلتا جاتا ہے اور اس کے اندر پوشیدہ [illegible] گوہر کی چمک قاری کے ذہن و دل کی نظر کو خیرہ کرنے لگتی ہے۔ جناب شہزادہ بسمل اپنے افسانوں میں واقعات کی جس فنی مہارت اور پُراثر انداز میں منظر کشی کرتے ہیں اُس کا اندازہ افسانے پڑھنے کے بعد ہوتا ہے۔ جملوں کی ساخت اور استعاروں کا استعمال مصنف کو اتنا اچھا آتا ہے کہ افسانوں کا ہر جملہ قاری کے دل کے تاروں کو چھیڑ کر اُس کے جذبات و احساسات اور اُمنگوں کو خاموش ارتعاش پیدا کرتا ہے اور قاری خود کو افسانے کا کردار محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جناب شہزادہ بسمل کو قاری کی توجہ حاصل کرنے اور اُس کے دل میں دلچسپی، تجسس اور اشتیاق کو اُبھارنے کا فن آتا ہے۔

—— ڈاکٹر نذیر مشتاق



خوشبو کی موت

(افسانوی مجموعہ)

شہزادہ بسمل

تبسّم پبلی کیشنز

A/1_115 محلہ ابراہیم، بمنہ، سرینگر-190018

....

ہمیں موت کی تیز خوشبو نے پاگل کیا ہے
امیدوں کی سرخ آب دوزوں میں سہمے
تباہی کے کالے سمندر میں
بہتے چلے جا رہے ہیں
کراں تا کراں
ایک گاڑھا کسیلا دھواں ہے

------------------------- ساقی فاروقی کی ایک نظم سے

خوشبو کی موت

(افسانوی مجموعہ)

نام کتاب : خوشبو کی موت (افسانوی مجموعہ)

مصنف : شہزادہ بسمل (9419475995, 8494061671)

صفحات : 128 (سائز: 23x36/16)

سالِ اشاعت : 2018ء (تعداد: ایک ہزار)

کمپیوٹر کمپوزنگ : **TFC سنٹر** گاؤ کدل سرینگر #9419525103

طباعت : **الحیات** پرنٹوگرافس سرینگر 9906662404

قیمت : 150 روپے

KHUSHBOO KI MOUT

(Urdu Short Stories)

by

Shahzada Bismil

ناشر

تبسم پبلی کیشنز

A/1-115 محلہ ابراہیم، بمنہ، سرینگر-190018

9419475995, 8494061671

ترتیب



اِنتساب

اپنی بیگم کے نام

خلوصِ دل کے ساتھ

جنہوں نے بچوں کو خود سنبھالا

اور

میرے لکھنے پڑھنے میں کبھی بادھا

نہیں ڈالی

" جناب شہزادہ بسملؔ کا ہر افسانہ گویا سمندر ہے جو ہر سطر کے ساتھ
پرت پرت کھلتا جاتا ہے اور اس کے اندر پوشیدہ لعل و گوہر کی چمک
قاری کے ذہن و دل کی نظر کو خیرہ کرنے لگتی ہے" ۔
--------------------------ڈاکٹر نذیر مشتاق

پیشِ لفظ

ڈاکٹر نذیر مشتاقؔ

افسانہ نگار دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو کہ صرف تصورات اور تخیلات کی دنیا میں بستے ہیں، حقیقی زندگی کے ساتھ اُن کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اُن کی تخلیقات بھی تصوراتی ہوتی ہیں اور عام طور پر اُن کی ہر تخلیق کا پلاٹ ایک ہی ہوتا ہے۔ صرف کرداروں اور کہانی میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ اُن ادیبوں کو زبان پر کافی عبور حاصل ہوتا ہے اور وہ الفاظ کے الٹ پھیر سے نئی نئی کہانیاں تخلیق کرتے رہتے ہیں۔ اُن کی تخلیقات سے زبان و ادب کے ذخیرے میں کچھ اضافہ ضرور ہوتا ہے لیکن زندگی کی واقعی حقیقتوں سے دور یہ تخلیقات انسانی معاشرہ کو کچھ خاص عطا نہیں کرتیں۔ یہ افسانے تھکے ہوئے انسانی اذہان کو وقتی طور پر تفریح ضرور فراہم کرتے ہیں لیکن انسانی دلوں پر کوئی دیرپا نقش ثبت کرنے سے قاصر رہتے ہیں جس کی وجہ سے ایسی تخلیقات بہت جلد فراموش کردی جاتی ہیں۔ اس طرح ان سے زبان وادب کی بھی کوئی خاص خدمت نہیں ہو پاتی۔

افسانوی ادیب کی دوسری قسم وہ ہے جو معاشرہ کا بیدار فرد ہوتا ہے۔ اُن کے افسانے اُن کے آس پاس کے ماحول اور معاشرہ میں ہی جنم لیتے ہیں۔

ایسا افسانہ نگار اپنی ہر کہانی کا خود کا ایک جیتا جاگتا اور بولتا کردار ہوتا ہے بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ ادیب بذات خود آدھی کہانی ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ ادیب آدمی کہانی جھیلتا ہے اور آدھی بولتا ہے۔ اُس کے لیے ایک پلاٹ بنا کر اُس میں کرداروں کو جوڑنا اور پھر اُن کے ذریعے کچھ مکالات کہلوا دینے کا نام افسانہ نہیں ہوتا۔ افسانہ دراصل انسانی معاشرہ اور جذبات و احساسات کا آئینہ دار ہوتا ہے بلکہ حقیقی ادب وہی ہوتا ہے جو معاشرہ کی دُکھتی رگ پر نشتر لگائے اور رستے ناسوروں پر مرہم کا چھاپ رکھے اور انسانوں کے لیے ایک صحت مند معاشرہ کی راہیں ہموار کرے۔ وہی ادب انسانی ذہن و دل دونوں کو متاثر کر کے انسانی معاشرہ پر دیرپا نقوش و اثرات مرتب کرتا ہے جس سے نہ صرف انسانیت کی بلکہ زبان و ادب کی بھی صحیح خدمت انجام پاتی ہے۔

جناب شہزادہ بسمل کا شمار افسانہ نگاروں کی اس دوسری قسم میں ہوتا ہے۔ اُنہوں نے جو کچھ بھی آج تک لکھا ہے اور چھپوایا ہے وہ صرف حصول شہرت کے لیے نہیں بلکہ اس کے پیچھے زبان و ادب کی خدمت کا جذبہ کارفرما ہے۔ اُن کی شخصیت، صالح اقدار کی حامل ہے اور وہ نہایت سختی کے ساتھ اپنے اصولوں کی راہوں پر گامزن ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اچھا فنکار وہی ہوتا ہے جو اصل زندگی میں بھی اچھا اور سچا ہو۔

شہزادہ بسمل کا اصلی نام غلام قادر خان ہے۔ انہوں نے کمسنی سے ہی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے اور بے شمار سختیاں جھیلیں ہیں۔ اُنہیں سکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کالج کا لا اُبالی پن اور یونیورسٹی کی رنگین فضائیں اور معطر ہوائیں نصیب نہ ہوسکیں۔ اُنہیں بی اے اور اُردو ادبیات کی ڈگریاں پرائیویٹ اُمیدوار کے طور حاصل کرنا پڑیں۔ اپنے شوق کو پروان

چڑھانے کے لیے انہوں نے ہندی ادبیات میں واردھا گجرات کے چند امتحانات پاس کر کے ہندی زبان میں بھی کماحقہٗ دسترس حاصل کر لی۔ میٹرک کا امتحان پاس کرتے ہی اُنہوں نے ماہوار پچاس روپیہ بحیثیت کلرک نوکری حاصل کر لی۔ وہ جموں و کشمیر یونیورسٹی میں سات سال تک بحیثیت ایک کلرک اپنے فرائض انجام دیتے رہے اور بعد ازاں بورڈ آف سکول ایجوکیشن سے بحیثیت جوائنٹ سیکرٹری ایڈمنسٹریشن (کلاس ون گزیٹیڈ آفیسر) سبکدوش ہوئے۔

سن ۱۹۶۲ء سے انہوں نے مختلف اخبارات (نیا سنسار، آفتاب، مسلم) کے لیے متفرق مضامین لکھنے شروع کئے اور پھر سن ۱۹۷۴ء سے پندرہ روزہ مسلم کے لیے کالم بعنوان ''چلتے چلتے'' تحریر کرتے رہے۔ بعد ازاں انہوں نے پندرہ روزہ احتساب کے لیے کالم بعنوان قوس قزح لکھے اور اُسی دوران ماہنامہ **الحیات** کے لیے سات رنگ عنوان کے تحت کالم لکھتے رہے۔ اُن کا ایک بڑا کارنامہ کشمیر عظمیٰ کا ہفت روزہ کالم چلتے چلتے ہے جس میں سیاسی، معاشی، مذہبی، سماجی اور ادبی موضوعات پر طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں اور پڑھنے والوں کی داد وصول کرتے رہتے ہیں۔ اُن کے کالم کا قارئین کو بے صبری کے ساتھ انتظار رہتا ہے۔ اُن کے قلم میں جادو ہے، پڑھنے والا مسحور ہو کے رہ جاتا ہے۔

شہزادہ بسملؔ کا ایک افسانوی مجموعہ بعنوان رقصِ بسمل سن ۱۹۸۵ء میں جموں سے شائع ہوا ہے جس کو ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ جموں نے سکول لائبریز کے لیے منظور کیا تھا۔ اُس کا دوسرا ایڈیشن بھی حال ہی میں منظر عام پر آچکا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اُردو میں سیرت پاک پر کتاب

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہندو صحائف میں'' بھی لکھی ہے اور ''خدا کے لیے مجھے بچاؤ'' (جھیل ڈل کی کہانی اُسی کی زبانی) لکھ کر پڑھنے والوں سے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ شہزادہ بسملؔ صاحب ادبی دنیا میں رواں دواں ہیں وہ کبھی بیکار نہیں بیٹھتے۔ اس وقت موجودہ افسانوی مجموعہ کے علاوہ اُن کے پاس ایک ناول، ایک ناولٹ، چھ طویل کہانیاں، گلدستہ اشعار (بیت بازی کے لیے منفرد انداز میں) اور بھی کچھ تکمیل کے مراحل سے گذرر ہے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کے لکھے ہوئے منتخب کالم بھی شاید چھ جلدوں پر محیط ہوں گے۔ شہزادہ بسملؔ صاحب ایک ہر دلعزیز شخصیت ہیں۔ وہ ہفتہ وار مسلم، ماہنامہ الحیات کے ایڈیٹوریل بورڈ کے ممبر ہونے کے علاوہ بورڈ آف سکول ایجوکیشن کے اَن فیر مینز کمیٹی کے ممبر اور جموں و کشمیر فکشن رائٹرس گلڈ کے نائب صدر اول بھی ہیں۔

شہزادہ بسملؔ صاحب ایک اعلیٰ پایہ کی شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ ایک سیدھے سادھے ملنسار انسان یاروں کے یار، ذہین اور سخی انسان ہیں۔ آپ صحیح معنوں میں عاشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں اور قرآن شریف کی باقاعدہ روزانہ تلاوت اُن کی زندگی کی اولین ترجیح ہے۔ اُن کی یاداشت غضب کی ہے، حالانکہ سر کی جراحی نے اُن سے بہت کچھ چھین لیا، مگر پھر بھی سینکڑوں شعراء کے اشعار اُن کے ذہن میں محفوظ ہیں اور ہر وقت برمحل اُن کا استعمال کر کے سُننے والوں کو چونکا کر اُن سے خوب داد و تحسین وصول کرتے ہیں۔

زیر نظر افسانوی مجموعہ ''خوشبو کی موت'' جناب شہزادہ بسملؔ کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ ہر افسانے کے آغاز میں ایک خوبصورت شعر ہے جس سے افسانے کا حُسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

کنٹڑ ادیب لیوٹا نے کہا ہے

''سمندر جب اپنا پیرہن اتارتا ہے تو موتی اور جواہرات نظر آتے ہیں''۔

جناب شہزادہ بسملؔ کا ہر افسانہ گویا سمندر ہے جو ہر سطر کے ساتھ پرت پرت کھلتا جاتا ہے اور اس کے اندر پوشیدہ لعل و گوہر کی چمک قاری کے ذہن و دل کی نظر کو خیرہ کرنے لگتی ہے۔

جناب شہزادہ بسملؔ اپنے افسانوں میں واقعات کی جس فنی مہارت اور پُراثر انداز میں منظر کشی کرتے ہیں اُس کا اندازہ افسانے پڑھنے کے بعد ہوتا ہے۔ جملوں کی ساخت اور استعاروں کا استعمال مصنف کو اتنا اچھا آتا ہے کہ افسانوں کا ہر جملہ قاری کے دل کے تاروں کو چھیڑ کر اُس کے جذبات و احساسات اور اُمنگوں کو خاموش ارتعاش پیدا کرتا ہے اور قاری خود کو افسانے کا کردار محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جناب شہزادہ بسملؔ کو قاری کی توجہ حاصل کرنے اور اُس کے دل میں دلچسپی، تجسس اور اشتیاق کو اُبھارنے کا فن آتا ہے۔ رومانیت، محبت میں ناکامی، حُسن، خوبصورتی، عشق و محبت، نفرت و حقارت، احساس جرم، ندامت، بے بسی و خود سپردگی، خوشی و مسرت، رنج و الم، حسرت و یاس، انسانی اوصاف و جذبات کا وہ کون سا رنگ ہے جو ان افسانوں میں جھلکتا ہوا نظر نہیں آتا۔ یوں تو سبھی افسانے مختصر ہیں لیکن کچھ افسانے زیادہ ہی مختصر ہیں مگر اُن کے اختصار میں کتنی طوالت اور وسعت ہے وہ پڑھنے کے بعد ہی معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ پلاٹ، وحدت تاثر اور اختصار کے علاوہ ایک معیاری افسانے کے لیے جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ اُس کا دلچسپ ہونا ہے اگر پڑھتے ہوئے اکتاہٹ طاری ہونے لگے تو وہ افسانہ نگار کی ناکامی ہے۔

جناب شہزادہ بسملؔ کے افسانوں میں تجسس اور اشتیاق کی کیفیت افسانہ پڑھنے پر قاری کو آمادہ کرتی ہے۔ بسملؔ صاحب افسانہ لکھنے کے فن سے واقف ہیں (حالانکہ اُن کے کالم زیادہ مقبول ہوئے ہیں)۔ اُن کی زبان سیدھی سادھی شُستہ اور شیریں ہے۔ وہ بہت ہی سیدھے سادھے انداز میں اپنے من کی بات دوسروں تک پہنچانے کا فن جانتے ہیں۔

بہر حال اُن کا سترہ افسانوں پر مشتمل مجموعہ ''خوشبو کی موت'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اُمید ہے کہ آپ کو یہ سبھی افسانے پسند آئیں گے اور آپ انہیں پڑھ کر لطف اندوز ہوں گے۔ میں ذاتی طور اس افسانوی مجموعہ کی اشاعت پر جناب شہزادہ بسملؔ کو دل کی عمیق گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ اس کتاب کو عوام وخواص میں وہ پذیرائی حاصل ہوگی جو اس کا حق ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جناب شہزادہ بسملؔ کو صحت کامل عطا فرمائے تا کہ وہ ادبی میدان میں اور جوش وخروش سے دوڑتے رہیں اور آئندہ بھی اس طرح اپنے عمدہ، موثر اور دلنشین افسانوں سے اُردو کے دامن کو مالا مال کرتے رہیں گے۔

ڈاکٹر نذیر مشتاق (ایم ڈی)
صدر جموں وکشمیر فکشن رائٹرس گلڈ

سرینگر
۲۰ رمئی ۲۰۱۸ء

اپنی بات

میں اپنے بارے میں کیا عرض کروں من آنم کہ من دانم۔ ڈاکٹر نذیر مشتاق صاحب میرے محب و محسن ہیں۔ انہوں نے پیش لفظ میں میرے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے بلکہ میرے خیال سے مبالغے سے کام لیا ہے۔ یہ بہرحال اُن کی محبت ہے۔ زیر نظر کتاب اُن کے مسلسل اصرار سے چھپنے کے لیے دی گئی تھی ورنہ میری سہل انگاری اور عدیم الفرصتی کی وجہ سے شاید یہ مجموعہ یونہی پڑا رہتا۔ اُن کا تاہم میں بے حد ممنون ہوں۔ میں ڈاکٹر جوہر قدوسی صاحب بلکہ اُن کی زیر نگرانی ادارہ **TFC / الحیات** پرنٹو گرافرس کا بھی تہہِ دل سے شکر گذار ہوں جن کی وساطت اور ذاتی دلچسپی سے یہ مجموعہ چھپائی کے مراحل سے گذرا ہے۔

میں نے اپنا ادبی سفر افسانہ لکھنے کے ساتھ ہی شروع کیا تھا وہ بہت پرانی بات ہے۔ سن ستّر کے ابتدائی برسوں میں میرے لکھے ہوئے وہ افسانے آفتاب اور دوسرے اخباروں میں چھپتے تھے۔ مگر بعد میں یعنی سن ۱۹۷۴ء سے میرا رجحان کالم نویسی کی طرف ہو گیا تو میں نے اخبار پندرہ روزہ مسلم کے لیے ایک مزاحیہ کالم چلتے چلتے لکھنا شروع کیا جو چلتے چلتے پھر لگ بھگ چالیس برس تک چلتا رہا۔ مگر اسی دوران میں نے نو برس تک پندرہ روزہ اخبار

احتساب کے لیے زیر عنوان قوس قزح، بارہ برس تک ماہنامہ الحیات کے لیے زیر عنوان سات رنگ کالم لکھے اور پھر یکم جولائی سن ۲۰۰۹ء سے آج تک روزنامہ کشمیر عظمیٰ کے لیے ہفتہ وار کالم زیر عنوان چلتے چلتے لکھتا آیا ہوں۔

حق بات یہ ہے کہ بڈگام سے میرے ایک قاری ہر بار جب بھی مجھ سے فون پر رابطہ قائم کرتے باصرار یہ تقاضا کرتے کہ میرا قلم کالم نہیں بلکہ افسانے کا متقاضی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کالم کے علاوہ میں پھر افسانے کی طرف لوٹ آیا ہوں۔

میں ہائی سکول میں ایک عام سا طالب علم تھا مگر میرے اُستاد جنت نشین مرحوم سید اکبر جے پوری صاحب کو پتہ نہیں اس احقر میں کیا نظر آیا جو انہوں نے مجھے لکھنے کی ترغیب (Inspiration) دی۔ میں اگر کچھ لکھتا ہوں یہ انہی کا فیض و کرم ہے۔

کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے میری کوتاہیوں کی نشاندہی ضرور کریئے گا، میں منتظر رہوں گا۔

شہزادہ بسمل

سرینگر
۲۴رمئی ۲۰۱۸ء

بہتی دھارا

ہمیں تنہائیوں میں یوں تو کیا کیا یاد آتا ہے
مگر سچ پوچھیے تو اِک چہرہ یاد آتا ہے
(ابو محمد سحر)

بہتی دھارا

شام گہری ہو کر اپنے پیچھے آنے والی رات کو الوداع کہہ کے جا چکی تھی اور سرمئی اندھیرا چھٹکی ہوئی چاندنی کے ساتھ متصادم ہو رہا تھا۔ نور و ظلمات کا یہ سنگم عجیب چھب دکھلا رہا تھا۔ آئی ہوئی رات کی پرچھائیاں دھیرے دھیرے اپنے پر پھیلا رہی تھی۔ ٹرین ایک کالی ناگن کی طرح تیز رفتاری کے ساتھ رواں دواں تھی اور آگے ہی آگے اپنی ناک کی سیدھی میں جا رہی تھی۔ ڈبے کی کھڑکیاں کھلی تھیں اور کبھی کبھی ٹرین کا زوایہ تبدیل ہونے پر چاندنی کی کرنیں بھی چھن چھن کر ڈبے میں آ کر اٹھکیلیاں کرنے لگتی تھیں۔ باہر کا سارا ماحول چاندنی میں نہایا ہوا لگتا تھا۔ پیڑ پودے، جل تھل، بجلی کے کھمبے ہر ایک چیز پر نقرئی پانیوں کی ایک لیپ سی چڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ پیچھے کو بھاگتی ہوئی ساری دھرتی اور سارا ماحول گرچہ رومانی اور عشق انگیز تھا مگر کھڑکی سے منہ ہٹاتے ہی ٹرین کی مخصوص بدبو سے سارے رومان پر اوس پڑ جاتی تھی۔ بوگی میں گرچہ کئی بلب جل رہے تھے مگر اُن کی یرقان زدہ روشنی مشکل سے اپنا حق ادا کر رہی تھی۔ مسافروں میں کچھ اونگھ رہے تھے اور اُن کے سر بار بار پنڈولم ہو رہے تھے۔ بیشتر ابھی جاگ رہے تھے اور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اتفاق سے مجھے سب سے نچلا برتھ ملا تھا اور میرے بالکل عین سامنے والے برتھ پر ایک نوجوان عورت اپنے دو بچوں کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ عورت بہت خوبصورت تھی مگر بچے اُس کے بالکل برعکس تھے۔ کیا معلوم شاید باپ پر گئے ہوں۔ اُن دو بچوں میں سے بڑا کوئی پانچ سال کا جب کہ چھوٹا دو اڑھائی سال کا لگتا تھا۔ بہر حال مجھے کیا میں نے اپنے خیالات کو جھٹک دیا۔ تھوڑی دیر

کے بعد بڑا جب برتھ پر لیٹ گیا تو عورت چھوٹے کو سُلانے کی کوشش میں دھیمے دھیمے سُروں میں لوری گانے لگی۔

عورت بچے کو آہستہ آہستہ تھپکیاں دیتی جارہی تھی اور میں اپنے خیالوں میں کہیں کھو گیا۔ کچھ دیر کے بعد گاڑی نے ایک لمبی سیٹی دی شاید کسی سگنل کے قریب ہورہی تھی۔ میں چونک پڑا مگر اسی اثناء میں اُس عورت نے دونوں بچوں کو ایک ساتھ آدھے برتھ پر سُلا دیا تھا اور خود آدھے برتھ پر سمٹ کر اپنے وجود کو سمانے کی کوشش کررہی تھی۔ عورت نے اُس وقت تک نہ میری طرف کوئی توجہ کی تھی اور نہ ہی میرے ساتھ کوئی بات کی تھی شاید اُس کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی یا اُس نے بے تکلف ہونے سے احتراز ہی کیا ہو۔ چونکہ میرے پاس ایک دو فالتو چادریں تھیں اس لیے میں نے ہی پہل کی۔

''بیٹی میرے پاس فالتو چادریں ہیں چاہو تو اپنے اور بچوں پر ڈالنے کے لیے لے سکتی ہو۔ دیکھو سنکوچ مت کرنا چادریں میلی نہیں ہو جائیں گی۔ ویسے بھی سفر میں ایک دوسرے کا ہاتھ نہ بٹائیں تو سفر بور کر دیتا ہے''۔

''نہیں بابا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لائیے ایک چادر دے دیجیے بچوں پر ڈال دیتی ہوں۔ خود تو مجھے گرمی لگ رہی ہے مجھے چادر کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چادریں میرے پاس بھی ہیں مگر سوٹ کیس کے نیچے پڑی ہیں''۔

میں بھی سونے کے لیے لیٹ گیا۔ نیند کب آئی، کتنی دیر تک سوتا رہا کچھ معلوم نہیں پڑا مگر کانوں میں جب کئی ملی جلی آوازیں پڑیں اور قلیوں کی تیز تیز باتیں کرنے کی صدائیں سنانے دینے لگیں تو میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا، گاڑی سٹیشن پر لگ چکی تھی، اجالا پھیل چکا تھا اور اسی جگہ میری ریل یاترا بھی

اختتام پذیر ہوتی تھی۔ آگے کا سفر کچھ تانگے سے اور کچھ پدیاترا بھی تھی۔ میں نے اپنا سامان سمیٹا، بیگ کو بند کر دیا اور اُس عورت سے جب الوداع کہنا چاہا تو وہ بھی لگ بھگ ٹرین سے اُترنے کے لیے تیار ہی تھی۔ اُس نے میری طرف ممنونیت کی نظروں سے دیکھا اور بچوں کو سنبھالتی ہوئی ٹرین سے اُتر گئی۔ مجھے اُس سے پوچھنا کہ اُسے کہاں تک جانا ہے خلافِ ادب لگا۔

اُس چھوٹے سے ریلوے سٹیشن سے نکل کر میں تانگے میں بیٹھا۔ گاؤں کے تانگے جیسے ہوتے ہیں وہ تانگہ بھی ویسا ہی تھا۔ آگے کو اُوپر اٹھا ہوا اور پیچھے سے جھکا ہوا۔ مجھے گھوڑے کی ہر ٹاپ پر لگتا تھا، میں گرا_____بس گرا_____یا گرنے ہی والا ہوں۔ کپڑوں کا بیگ پھسل پھسل جاتا تھا مگر خیر ہوئی میں گرا نہیں_____نہیں تو کچے راستے کی دھول مٹی سے میرا حلیہ بگڑ جاتا۔ تانگے میں کچھ دیر سفر کرنے کے بعد گاؤں میں پہنچنے کے لیے مجھے ندی کو کشتی سے پار کرنا تھا۔ حسبِ معمول جیسے تیسے سب کچھ ہوتا رہا مگر یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا وہ عورت بھی اُسی ناؤ میں بچوں کے ساتھ سوار ہو چکی تھی۔ ہم نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ایک دوسرے کا استقبال کیا۔ اتفاق سے ہم کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہی ناؤ میں بیٹھے کو جگہ ملی۔

ناؤ نے کنارا چھوڑ دیا۔ چپو پانی کے ساتھ نبرد آزما ہونے لگے اور مانجھی کے گیت نے فضا میں رنگینیاں بکھیر دیں۔

ہو_____ہوہو_____ہو_____ندیا چلے_____چلے رے دھارا_____چندا چلے_____چلے رے تارا_____تجھ کو چلنا ہوگا_____تجھ کو چلنا ہوگا_____ہو_____ہوہو_____ہو

بچوں پر ایک بار پھر نظر پڑتے ہی مجھے ایک کُرید سی لگی۔ تجسس انسانی

کمزوری ہے۔اس لیے میں اُس عورت سے سوال کر ہی بیٹھا۔

''بیٹی بُرا نہ ماننا کیا میں تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں''۔

اُس نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور اشارے سے اثبات میں سر کو ہلایا۔

''کیا گاؤں میں آپ کے پتی دیور ہتے ہیں''۔

''نہیں بابا میری ابھی شادی نہیں ہوئی ہے''۔اُس نے تڑ سے جواب دیا۔

''اچھا! اچھا! کیا یہ بچے کسی رشتہ دار کے ہیں''۔میں نے دوسرا سوال کیا۔

''نہیں بابا یہ بچے نہ میرے کسی رشتہ دار کے ہیں، نہ حرامی ہیں بلکہ صرف میرے ہیں''۔اُس نے بڑی بیزاری کے ساتھ کہا لگ رہا تھا کہ وہ اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔

''توبہ! توبہ بیٹی میرا مطلب یہ نہیں تھا______''

اُس نے ہاتھ کے اشارے سے میری بات کاٹ دی______

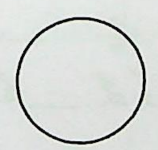
میں ایک سکول ٹیچر ہوں۔میرا تبادلہ پاس کے گاؤں میں ہوا ہے بلکہ ان بچوں کی خاطر میں نے تبادلہ خود کرایا ہے۔اِن بچوں کے ماں باپ میرے گھر کے پاس میری ہمسائیگی میں رہتے تھے۔پچھلے سال اُن کا ایک سڑک حادثے میں دیہانت ہوا۔چونکہ اُن کے نزدیکی اور دور پار کے رشتہ داروں اور یار دوستوں میں سے کوئی انہیں رکھنے کے لیے آگے نہیں آیا اس لیے میں نے ان کو گود لیا۔مجھے میرے گھر والوں اور رشتہ داروں کی مخالفت کا کافی سامنا کرنا پڑا مگر میں اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی۔اب یہ میرا فیصلہ صحیح ہے یا غلط وہ میں نہیں جانتی مگر یہ بہر حال ایک حقیقت ہے کہ ان کے پالن پوش سے مجھے دلی

سکون ملتا۔ اب یوں سمجھئے کہ یہی میری شادی ہے، یہی میرے پتی ہیں، یہی میرے بچے ہیں اور یہی میری دنیا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ میری دنیا بہت حسین ہے"۔

میں ہونقوں کی طرح کبھی اُس کو دیکھوں، کبھی بچوں کو دیکھو اور کبھی بہتی دھارا کو۔ دور کہیں ریل نے سیٹی بجائی۔ مجھے لگا جیسے وہ اپنے مسافروں سے کہہ رہی ہو"میں تمہاری کوئی نہیں پھر بھی میں تم لوگوں کو اپنے کندھوں پر سوار کرتی ہوں۔ اپنی گود میں تھپکیاں دے کر سلاتی ہوں اور منزل تک پہنچاتی ہوں جب کہ میری اپنی کوئی منزل نہیں ہوتی ہے۔

ندیا چلے___ چلے رے دھار
چندا چلے___ چلے رے تارا
مجھ کو چلنا ہوگا___ مجھ کو چلنا ہوگا___





غُبارے والا

زندگی کب روٹھ جائے گی بھروسہ کچھ نہیں
کیا کہے کوئی یقین سے وہ ہے فردا آشنا
(ظفرؔ مرادآبادی)

غُبارے والا

غُبارے والا______غبارے لے لو______

تقریباً بارہ تیرہ روز علیل رہنے کے بعد آج وہ پھر غبارے لے کر بستی کی طرف نکل پڑا۔ نیلی کوٹھی کے باہر وہ حسب معمول رُکا۔ اُس نے دو تین بار آواز دی۔ ''غبارے والا______غُبارے لے لو''۔ مگر گھر سے کوئی باہر نہیں آیا۔ اس وجہ سے اُس کا حیران ہونا لازمی تھا کیونکہ میڈم ہمیشہ پہلی ہی آواز پر باہر آجایا کرتی تھی اور بچے کے لیے کوئی غبارہ پسند کر کے لے جاتی تھی۔ حتیٰ کہ غبارے والے کو یہ بھی ہدایت تھی کہ کبھی اگر وہ آواز نہ سن پائے یا سُن کر نکلنے میں کچھ تاخیر ہو جائے تو وہ کچھ دیر تک توقف کیا کرے اور غبارہ دے کر ہی آگے بڑھے۔

کچھ انتظار کے باوجود بھی جب گھر سے کوئی باہر نہیں آیا تو میڈم کی ہدایت کے مدنظر اُس نے باہر والے لوہے کے جنگلے کو ایک دو بار بجایا تو اندر سے ایک ادھیڑ عمر کا خوش پوش آدمی باہر آ کر کہنے لگا۔

''بھئی ہمیں غبارہ نہیں لینا ہے''۔

''بابو جی بات دراصل یہ ہے کہ میڈم مجھ سے روز ایک غبارہ لیتی ہیں اور اُن کی ہدایت ہے کہ میں غبارہ دیئے بنا ہرگز یہاں سے آگے نہ بڑھوں۔ میں آج بارہ تیرہ روز کے بعد آیا ہوں اس لیے میڈم مجھ سے ناراض بھی ہوگی۔ اسی وجہ سے میں نے دستک دی۔ میں گستاخی کی معافی چاہتا ہوں جناب''۔

''ارے ارے کیا کہتے ہو۔ کوئی بات نہیں تم نے کچھ بُرا نہیں کیا۔ اصل

میں غبارے میری بیٹی اپنے بچے کے لیے لیا کرتی تھی جس بچے کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ وہ پچھلے سال اپنے باپ کے ساتھ ایک سڑک حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا۔ اُس حادثے نے میری بیٹی کے ذہن پر بہت بُرا اثر ڈالا تھا۔ وہ بچے کو مردہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھی اور ابھی آٹھ روز قبل ______ اُس کی زبان لڑکھڑا گئی ______

ٹوٹی ہوئی آواز میں بولا ______

''میڈم بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ تم سے خریدے ہوئے سارے غبارے اندر کمرے میں پڑے ہیں۔ چاہو تو اُنہیں سمیٹ کر لے جا سکتے ہو''۔



خوشبو کی موت

شبِ فراق یوں خوش ہو کے کاٹ دی ہم نے
وہ آ رہے ہیں، ابھی آئے، آئے جاتے ہیں
(بال کرشن مضطرؔ)

خوشبو کی موت

یہ چالیس سال اُدھر کی بات ہے ______ میر محی الدین اور ملک سیف الدین بہت گہرے دوست تھے۔ ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ میر صاحب شہری رئیس ہونے کے ناطے شہر میں رہتے تھے اور ملک صاحب گاؤں میں بود و باش رکھتے تھے۔ کاروباری اور زمینداری مصروفیات کی وجہ سے اگرچہ دونوں گھرانوں کا آنا جانا بہت ہی کم تھا مگر دونوں دوست جب بھی ملتے تو والہانہ ملتے تھے۔ دونوں کے بچے جب جوان ہوئے تو دوستی کو اور زیادہ پائیدار اور مضبوط بنانے کے لیے انہوں نے ایک دوسرے کے ہاں رشتہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میر محی الدین کی بیٹی رخسانہ خوبصورت، فہیم و دانش مند ہونے کے علاوہ تعلیم یافتہ بھی تھی۔ ملک صاحب کے صاحبزادے خاورؔ بھی ایک کامیاب بزنس مین اور اپنے حلقے میں کافی مقبول تھے۔ اس لیے اونچ نیچ یا پسند ناپسند کا سوال پیدا نہیں ہوا۔ بڑوں نے فیصلہ کرلیا اور بچوں نے اُسے قبول کرلیا۔ رسمی طور شادی سے قبل ملنا، ایک دوسرے کو دیکھنا اور سمجھنا، ایسی باتیں اُن دنوں عام طور پر اور وہ بھی خاص کر رؤساء میں معیوب سمجھی جاتی تھیں۔ اس لیے شادی مروجہ طریقے مگر ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ ہوگئی۔

روایتی طریقے سے دُلہن سات دن کے بعد واپس مائیکے لوٹ کر آئی۔ کچھ دنوں یا سماجی دستور کے مطابق ہفتہ عشرہ، مہینہ دو مہینہ مائیکے میں گذار کر اُسے پھر سسرال جانا تھا مگر وہ نہیں گئی۔ اُس نے جانے سے انکار کردیا اور سب کو شش و پنج میں ڈال کر حیران کردیا۔ اُدھر سے سسرال والوں نے بُلاوا بھیجا، آدمی دوڑائے، پھر سمدھی خود بلکہ دولہے میاں بھی رخسانہ کی رخصتی کے لی

آئے مگر وہ کسی بھی صورت میں سسرال جانے کو تیار نہیں ہوئی۔ اس صورت حال کو دیکھ کر گھر والوں کے علاوہ رشتہ داروں، واقف کاروں اور دوستوں نے بھی مداخلت کی مگر نتیجہ پھر وہی ڈاک کے تین پات۔ رخسانہ کا انکار اقرار میں متبدل نہ ہو سکا۔ اُس سے سسرال نہ جانے کی وجہ بھی دریافت کی گئی مگر اُس پر بھی اُس نے مکمل طور سے چُپ سادھ لی۔ کوئی وجہ نہیں بتائی بس انکار اور مکرر انکار کرتی رہی۔ رخسانہ کی ایک واحد مگر بہت قریب اور راز دار سہیلی عاصمہ تھی۔ اُس نے بھی اپنے طریقے سے رخسانہ کے انکار کی وجہ جاننے کی کوشش کی مگر اُس کو بھی کوئی کامیابی نہیں ملی۔ حالانکہ اُسے اِس بات کا ملال بھی ہوا کہ اُس کی سہیلی نے اُس کو اپنے راز سے بیگانہ ہی رکھا جس کی اُس کو توقع نہیں تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد رخسانہ نے وکیل کے ذریعے سسرال کا تمام کپڑا لتہ، زیور اور مہر لوٹا کر خود سے ہی خلع کا مطالبہ کیا۔ اس بیچ گرچہ بڑوں میں بھی تھوڑی سی دوری پڑ گئی، مگر دونوں سیانے تھے اور اُن کا اس معاملے میں کوئی ذاتی قصور یا پہلو تہی بھی نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنے ذاتی اور تجارتی تعلقات میں کوئی کڑواہٹ پیدا ہونے نہیں دی۔

اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے رخسانہ نے محکمہ تعلیم میں ملازمت کے لیے درخواست دے دی تو اُسے جلدی ہی اُستانی کی حیثیت سے تقرری ہوئی اور یوں اُس کی مصروفیت کا بندوبست ہونے کے بعد اُس کے شب و روز بیتنے لگے۔ دُنیا کا کاروبار چلتا رہا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ لوگ اس بات کو بھول گئے______

دن گذرتے گئے اب رخسانہ کی عمر پچاس برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ اُس

کی صحت بھی کافی حد تک بگڑ چکی تھی۔ آئے دن مختلف تکالیف کے علاوہ جوڑوں میں بھی درد رہتا تھا۔ اُس نے مشترکہ فیملی سے کافی عرصہ پہلے ہی کنارہ کشی اختیار کی تھی اور اس دوران اُس کی ایک بیوہ بُوا اُس کے ساتھ رہنے کو آئی تھی اس لیے دُکھ تکلیف میں وہی اُس کا سہارہ بنتی تھی۔ جوں توں کر کے ملازمت کے دن پورے ہوئے۔ بحیثیت ایک ٹیچر کے وہ کافی مقبولیت حاصل کر چکی تھی بلکہ بیسٹ ٹیچر کے اعزاز سے بھی نوازی جا چکی تھی۔ اس لیے اُس کی سبکدوشی بھی بڑے عزت و اکرام کے ساتھ ہوگئی۔

اور دس برس بیت گئے ______

مگر اتنے برس بیت جانے کے باوجود بھی اُس اذیت ناک واقعے کی تلخ اور کچوکے لگانے والی یادیں اُس کے دل و دماغ سے کبھی اور کسی طور رفع نہ ہو سکیں۔

رخسانہ کافی دنوں سے بیمار بلکہ صاحب فراش ہو چکی تھی۔ لگ رہا تھا کہ اب وہ زیادہ دنوں تک جی نہیں پائے گی۔ یہی نہیں بلکہ خود بھی اُس نے جینے کا حوصلہ لگ بھگ چھوڑ دیا تھا۔ ایک دن اُس کی سہیلی عاصمہ بہت دیر تک اُس کے پاس بیٹھی رہی اور اُسے حوصلہ دیتی رہی۔ اسی دوران اُس نے ایک بہت پرانی اور بھولی بسری بات چھیڑ دی۔ اُس نے رخسانہ سے کہا:

رخسانہ اللہ تمہیں لمبی عمر دے مگر پھر بھی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ آج مرے کل دوسرا، میں بھی اب اور کتنا جیوں گی۔ کیا تم وہ راز اپنے ساتھ ہی لے جاؤ گی۔ کیا اب بھی وہ بات نہیں کھولو گی کہ تم شادی کے بعد دوبارہ سُسرال کیوں نہیں گئی۔ آخر ایسی کیا وجہ تھی، کیا راز تھا اور یوں تم نے اپنی ساری زندگی بے یار و مددگار تنہا کسی سہارے کے بغیر تمام کر دی۔

رخسانہ پہلے تو ہکا بکا مبہوت بنی اُس کی طرف دیکھتی رہی۔لگ رہا تھا کہ اُس کی زندگی کے کربناک لمحوں کی اذیت ناک یادیں پھر سے تازہ ہو گئیں ہیں۔اُس کی آنکھوں سے دو چشمے اُبل پڑے جو اپنے ساتھ اُس کی گذری ہوئی زندگی کی تمام کثافت اور تلخیاں بہا کر لے گئے۔خوب رو لینے اور آنسو بہانے کے بعد وہ کہنے لگی:

''عاصمہ میری پیاری بہن میں اُس وقت اگر وہ بات افشا کرتی تو بہت بڑا ہنگامہ کھڑا ہو جاتا بلکہ یقینی طور کچھ قتل بھی ہو جاتے۔اس لیے میں نے اپنی زبان کو بند رکھنا ہی مناسب جانا۔مگر مرنے سے پہلے میں تمہیں اور صرف تمہیں وہ بات بتاؤں گی جس وجہ سے میں نے سسرال کو تیاگ دیا اور ساری زندگی تنہائی اور بے چارگی میں گذاری''۔

رخسانہ سانس لینے کے لیے رک گئی، دم سنبھالا، دو گھونٹ پانی پی کر پھر گویا ہوئی۔

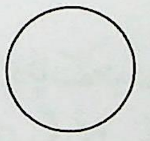
''تمہیں یہ تو معلوم ہی تھا کہ میری سسرال والے علاقے کے رئیس لوگ تھے۔اُنہوں نے شادی دھوم دھام سے کی اور ولیمہ کے بعد گانے بجانے کی محفل آراستہ کی تھی جس میں کوئی پیشہ ور عورت ناچ بھی رہی تھی۔گھر کے سارے مرد، رشتہ دار، مہمان، ہمسائے اور یار دوست محفل میں شریک ناچ گانے کا لطف اٹھا رہے تھے کیونکہ ملے جُلے شور ہنگامے کی آوازیں میرے کانوں میں بھی پڑ رہی تھیں اور گھر کی لڑکیاں بھی چوری چھپے ایک آدھ نظر ڈال کر آتیں تھیں۔اسی دوران گھر کی اور مہمان عورتوں اور لڑکیوں نے مجھے سجا سنوار کر حُجلہ عروسی میں لا کر پھولوں سے سجی سجائی مسہری پر بٹھا دیا اور خود دروازہ بند کر کے ہنستی مسکراتی واپس چلی گئیں۔کوئی دس پندرہ منٹ ہوئے

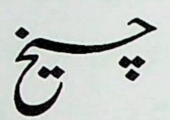
ہوں گے کہ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز جب میرے کانوں میں پڑی تو میں سکڑ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ کمرے میں نائٹ لیمپ کی مدھم سی روشنی تھی۔ کوئی خوشبوؤں میں بسا وجود میرے قریب آیا اور سرگوشیوں میں میرے ساتھ پیار بھری میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا۔ میں مسحور ہوگئی اور اُس کے بعد عطر و عنبر کے ہنڈولے پر بیٹھ کر ہم دونوں پتہ نہیں کن گلستانوں اور پرستانوں کے اوپر محو پرواز رہے۔ کم روشنی کے باوجود بھی مجھے میرا ہمدم وجیہہ اور پیارا لگا۔ جی چاہا کہ اُسے اپنے وجود میں چھپا کر رکھ لوں، اپنے آپ میں مدغم کرلوں۔ تقریباً گھنٹہ سوا گھنٹہ اُنس واُلف اور والہانہ چاہت کے جلترنگ بجنے کے بعد وہ اُٹھا اور یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا'' ۔آپ تھوڑی دیر آرام کرلیں میں جلدی لوٹ آؤں گا''۔

''پیار کی میٹھی اور عشق انگیز دنیا کے مزے لوٹ کر میری نیندیں اُڑ چکی تھیں۔ میں نے سوچا میں سوؤں گی نہیں بلکہ اپنے دولہے کا ہی انتظار کروں گی۔ میں حسین دنیا کے تانے بانے بُننے میں کھوگئی۔ تقریباً آدھا پونا گھنٹہ ہوا ہوگا۔ پھر دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ میں اشتیاق بھرے انتظار کے ساتھ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ کوئی میری مسہری پر آیا۔ اُس کے منہ سے شراب کی بدبو آرہی تھی۔ میں نے چونک کر اُسے دیکھا مگر یہ ______ وہ نہیں تھا ______ پھر ______ پھر اگر یہی میرا دولہا تھا ______ تو پھر وہ ______

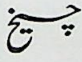
وہ کون تھا؟''







غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا
(داغ)


چیخ

خزاں کی میٹھی میٹھی ٹھنڈ شروع ہو چکی تھی ____ رات کا وقت تھا۔ سینما کا آخری شو دیکھ کر ایک نوجوان اُس سنسان سڑک پر اکیلا ایک فلمی گانا گاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اپنی ہی دُھن میں ____ اپنی ہی لے میں ____ اپنی ہی مستی میں ____ سنسان سڑک، رات کی تاریکی، خاموشی اور اکیلے پن سے بے پرواہ ____ مست ____ آگے ہی آگے کو بڑھتا ہوا۔

آنکھوں میں نیندیں نہ دل میں قرار
محبت بھی کیا چیز ہوتی ہے یار

ایک جگہ سڑک کے کنارے کھپریل کی پناہ گاہ میں ایک ادھیڑ عمر کی بھکارن چیتھڑے اور ٹاٹ کے ٹکڑے ترتیب سے رکھ کر لیٹنے کی تیاری کر رہی تھی۔ شاید وہ بھی بستی کے بازار سے مانگ کر دیر سے ہی لوٹی تھی یا پیٹ کا سادھن کرنے میں دیر ہو گئی ہو۔ جونہی گاتا ہوا نوجوان اُس کی جائے پناہ کے سامنے سے گذرا اور گانے کے بول اُس کی سماعت سے ٹکرائے تو وہ چونک پڑی اور بے چین سی ہو گئی۔ نوجوان اپنی ہی دُھن میں مست آگے بڑھتا چلا گیا۔ اُس نے بھکارن کو نہیں دیکھا البتہ بھکارن نے نظر اُٹھا کر اُس کو لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے سڑک سے گذرتے دیکھا۔ جب نوجوان نے مصرعہ گایا

ع پیار زندگی میں ہوتا ہے ایک بار

تو بھکارن کے منہ سے درد و کرب سے بھرپور ایک زوردار چیخ نکلی۔ نوجوان دور جا چکا تھا۔ اُس نے وہ درد بھری بھیانک چیخ نہیں سُنی۔ مگر اُس چیخ نے خاموش سماں کا سینہ چیر کر رکھ دیا۔ اُس چیخ نے سنسان رات کے کلیجے

پر دراڑیں ڈال دیں۔ مگر وہ چیخ انسانوں کے کانوں میں نہیں پڑی۔ پڑتی بھی تو کیا ہوتا؟ ایسی چیخیں کئی لوگوں کے کانوں میں روز پڑتی رہتی ہیں۔ مگر وہ اُن کو سُن کر بھی ان سُنا کر دیتے ہیں، اپنی راہ لیتے ہیں، کوئی توقف یا توجہ نہیں کرتے بلکہ کچھ لوگ تو اُن چیخوں پر قہقہے لگا لیتے ہیں۔ اس لیے اُس چیخ کا درد و کرب فقط بھکارن تک ہی محدود رہا۔ اُس کے دل میں ایک ٹیس اُبھری، ایک اذیت ناک درد جاگا جس نے اُس کے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ چیخ اُس کے وجود کے ساتھ ہی گھٹ کے رہ گئی۔

وقت کا دھارا بہتا رہا ـــــــ

آگے ہی آگے کو دوڑتا رہا ـــــــ

دنیا کا چکر چلتا رہا ـــــــ

اور رات بھیگتی رہی ـــــــ



تیرے لیے

دل جلا مجھ سانہ بیدلؔ اب ملے گا دہر میں
شمع روتی زہے گی عمر بھر میرے لیے
(بیدلؔ بیکانیری)

تیرے لیے

بھیڑ بھاڑ______ شور شرابہ______ چیخ وپکار اور دھکم پیل______ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ریلوے سٹیشنوں پر یہ سب کچھ ہوتا ہی ہے۔ کچھ لوگ آرہے تھے کچھ جا رہے تھے۔ افراتفری کا عالم تھا۔ ریلوے سٹیشن پر میں نے رابطہ پُل کو پار کر کے اور بیسیوں دھکے کھا کر آخر میں مطلوبہ پلیٹ فارم پر پہنچ گیا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر لگ چکی تھی اور کچھ دیر سستانے اور حواس درست کرنے کے بعد جب میں اپنے ڈبے کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ اسی دوران ایک لڑکی آکر میرے سامنے سے گذرنے لگی۔ غیر اختیاری طور پر جب میری نظریں لڑکی کی طرف اُٹھیں تو میں ٹھٹھک کے رہ گیا۔ اس دوران لڑکی میرے کافی نزدیک آچکی تھی۔ میرے منہ سے بے ساختہ______ ذلاری______ نکلا۔

لڑکی نے چونک کر استفہامیہ نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر بڑی شائستگی کے ساتھ کہا:

"نو سر میرا نام انجلی ہے۔ دُلاری میری مما کا نام ہے"۔

یہ کہہ کر اُس نے اپنی بائیں جانب نظریں گھمائیں جن کا میری نظروں نے بھی تعاقب کیا۔ مجھے وہاں ساڑھی میں ملبوس ایک عورت دکھائی دی جس کی پُشت ہماری طرف تھی اور وہ دوسری عورت کے ساتھ باتوں میں مشغول تھی۔ لڑکی نے نہ معلوم کیا سمجھا، کیا سوچا وہ آگے بڑھنے کی بجائے واپس مڑی اور اُس عورت کے پاس جا کر کان کے قریب منہ لے جا کر کچھ کہا۔ جلدی ہی دونوں ماں بیٹی میرے پاس آگئیں۔ میں دُلاری کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور وہ

بھی مجھے دیکھ کر کچھ ٹپٹا سی گئی۔

''آپ'' ____ دلاری نے ملی جلی خوشی اور تعجب کے ساتھ کہا ''آج کتنے برسوں کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا ہے۔ لگتا ہے صدیاں بیت گئی ہیں۔ کچھ اندازہ ہے پورے اٹھائیس برس ہو گئے۔ اُوماں! اتنے برس اتنی جلدی بیت گئے۔ یقین مانو بے حد خوشی ہوئی''۔

''دلاری! سناؤ کیسی ہو تم۔ مجھے تمہیں دیکھ کر حد سے زیادہ خوشی محسوس ہو رہی ہیے۔ بہت زیادہ اتنی کہ جس کا تم اندازہ نہیں کر سکتی۔ کیا اتفاق ہے اگرچہ اتنے برس بیت گئے مگر یہی کیا کم ہے کہ ایک بار پھر ملاقات ہو گئی۔ اچھا یہ بتاؤ اِدھر کیسے آئی ہو۔ کیا کہیں جانا ہے''۔

''نہیں فاروق مجھے کہیں نہیں جانا ہے۔ یہ میری لڑکی انجلی ہے''۔

پھر لڑکی کی طرف منہ کر کے ____ انجلی یہ فاروق صاحب ہیں کشمیر میں ہم ایک ہی محلے میں بالکل پاس پاس رہتے تھے۔ فاروق انجلی کو موبئی جانا ہے۔ یہ وہاں پڑھائی کر رہی ہے۔ سٹیشن پر اس کا بھائی لینے کے لیے آجائے گا۔ وہ بھی اُدھر ہی ایک پرائیویٹ کمپنی میں ٹیکسٹائیل انجینئر ہے۔ دونوں بھائی بہن کو حکومت مہاراشٹر کی طرف سے مائیگرنٹ کوٹا میں آرکشن پر سیٹ ملی تھی۔ لڑکے کو ٹریننگ کے بعد وہیں نوکری کی بھی سبیل ہو گئی تھی۔ شکر ہے بھگوان کا اس بارے میں مجھے کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑی''۔

میں نے محسوس کیا کہ دُلاری لڑکی کی موجودگی میں بہت محتاط انداز سے بات کر رہی تھی۔

''اچھا یہ سب چھوڑو آپ اپنی سناؤ ویسے جا کہاں رہے ہو''۔

اپنی سنانے کا یہ کوئی مناسب موقعہ تو ہے نہیں۔ ویسے مجھے بھی موبئی جانا

ہے بس یہی کوئی دس پندرہ دن کے لئے''۔ میں نے بھی بات کرنے میں محتاط انداز اختیار کرلیا۔

''اگر رہنے کا کوئی بندوبست نہیں تو بچوں کے ساتھ آرام سے رہ سکتے ہو۔ کاکاجی کے پاس وہاں کافی جگہ ہے۔ دیکھو تکلف یا سنکوچ کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی تو تمہارے اپنے بچوں کے سمان ہیں''۔

''اُس میں کیا شک ہے۔ نہیں کوئی تکلف کی بات نہیں۔ میں ایک دوست کی دعوت پر ہی اُس کے پاس جارہا ہوں۔ واپسی پر اگر ممکن ہوا تو تم سے مل کر ہی جاؤں گا''۔

''ٹھیک ہے مگر مل کے ضرور جانا۔ میں انتظار کروں گی۔ ہاں! میرا پتہ اور فون نمبر لکھ لو۔ اگر آتے وقت فون پر بھی اطلاع کروگے تو ٹھیک رہے گا''۔

حق بات یہ ہے کہ انجلی کی موجودگی میں بات کرنے میں کافی احتیاط برتنا پڑی بصورت دیگر دنیا کی پرواہ کئے بغیر میں دُلاری کے ساتھ والہانہ لپٹ جاتا۔ کیونکہ ہم واقعی اٹھائیس سال کی جدائی کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ مل رہے تھے۔

میں اُن سے رخصت ہوکر اپنی سیٹ پر آگیا______ گاڑی وقت پر چل پڑی۔ دروازے پر کھڑے ہوکر میں نے حدِ نظر تک دُلاری کو نظر میں رکھا اور ہاتھ ہلاتا رہا مگر وہ آنسو اُس سے اوجھل ہی رہے جو میری آنکھوں سے بے تحاشہ بہہ رہے تھے۔ اتفاق سے انجلی کی سیٹ بھی میرے ہی ڈبے میں دوسری طرف تھی۔ چونکہ وہ لڑکیوں میں بیٹھی تھی اس لیے میں نے اُسے اپنے ساتھ رکھنا مناسب نہیں سمجھا مگر ہر تین چار گھنٹے کے بعد میں اُس کی خیریت اور ضرورت دریافت کرتا رہا۔

سُپر فاسٹ ٹرین کی رفتار آدھی رات کے بعد کافی بڑھ جاتی ہے۔سب لوگ سو گئے مگر آرام دہ برتھ ہونے کے باوجود بھی نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ٹرین فراٹے بھر رہی تھی اور میرے خیالات بھی دور دشاؤں میں اُڑان بھر رہے تھے۔

دلاری اور میرا گھر سرینگر شہر کے ایک محلے میں بالکل آمنے سامنے اور پاس پاس تھے۔ہم دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے کو دلچسپ نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔یونیورسٹی میں بھی ہم نے داخلہ ایک ساتھ لیا فرق صرف یہ تھا کہ اُس کا مضمون ایجوکیشن اور میں اُردو میں ایم اے کر رہا تھا۔خالی اوقات میں ہم یونیورسٹی کے لان میں اکٹھے بیٹھے، باتیں کرتے، زمانے بھر کی، کبھی بامقصد اور کبھی کبھی بے مقصد اور فضول بھی۔ایک ساتھ کینٹین جاتے، پسند میں اختلاف نہیں کرتے اور گھر آنا جانا بھی تقریباً ایک ساتھ ہی ہوتا تھا۔ہم اس قدر قریب ہو گئے لگتا تھا کہ ہمارے جسم و جان بھی ایک ہو گئے ہیں اور اسی چاہت و محبت کے سبب ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ ساری زندگی گزارنے کا عہد کر لیا تھا۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ایک سونامی آئی اور اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گئی۔ایکبارگی ایک آندھی آئی جس نے سب کو اندھا کر دیا۔حالات حد سے زیادہ بگڑ گئے۔ایک رات کی صبح میرے لیے قیامت خیز ثابت ہوئی۔راتوں رات بیشتر کشمیری پنڈتوں نے راہ فرار اختیار کر لی، اور وہ سب اس رازداری کے ساتھ ہوا کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہو سکی کیونکہ کھڑکی سے جھانکنا بھی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔فوج اور پولیس کا پہرہ چپے چپے پر تھا۔ اس طرح سے میں نے اپنی دل کی دنیا کو خود اپنی آنکھوں سے لٹتے دیکھا۔

سن ۱۹۹۶ء میں جب حالات کچھ بہتر ہوئے میں نے جموں جا کر نگروٹہ کیمپ، پُرکھو کیمپ، دُمانہ، توپ شیر خان کوارٹرس اور نہ جانے کہاں کہاں دُلاری کو تلاش کیا مگر مجھے وہ کہیں نہیں ملی۔ کسی سے پوچھتا مگر اُس میں دلاری کی عزت بلکہ میری جان کو بھی خطرہ تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ واقعی جموں میں تھی یا کہیں اور کسی دوسرے شہر میں اس لیے میں مایوس و نامراد واپس لوٹ آیا۔

میں نے پوسٹ گریجویشن کر کے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں نوکری کرلی، پھر پی ایچ ڈی کر کے اور پی ایس سی کلیر کر کے کالج میں آیا مگر اس ساری مدت کے دوران دُلاری میرے جسم و جان میں رچی بسی رہی اور کبھی ایک پل کے لیے بھی مجھ سے دور نہیں ہوئی۔ میں مدت تک اُس کی چھٹی پتری یا کسی پیغام کا منتظر رہا مگر اُس کی جانب سے کوئی پہل نہیں ہوئی۔ میں نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی کہ اُس کا ماحول سازگار نہیں رہا ہوگا۔ سب کی اپنی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔

ممبئی سے واپس لوٹ کر میں سیدھا دلاری کے گھر پہنچا۔ اُس نے حد سے زیادہ مسرت کا اظہار کیا اور تقریباً دس منٹ تک مجھے گلے لگائے رکھ کر بے تحاشا آنسو بہاتی رہی۔ جب ہم دونوں نے اپنے اپنے حواس دُرست کئے تو اُس نے کہا کہ وہ گھر میں اکیلی رہتی ہے۔ جب بچے آتے ہیں تو کچھ رونق ہوجاتی ہے۔ ماں باپ بہت پہلے اور پتی پانچ برس قبل فوت ہو چکے ہیں۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد اُس نے اپنی مجبوری اور لاچاری کی ایک درد بھری داستان سنائی جس دوران اُس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو برستے رہے۔ رفیوجی کیمپوں کی تکالیف اور اپنی بے بسی کی روداد بتائی۔ اُس نے

بتایا کہ لڑکی ہونے کے ناطے وہ پڑھی لکھی ہو کر بھی اپنے سماج سے بغاوت نہ کر سکی کیونکہ حالات ہی ایسے تھے کہ میں کچھ بھی تمہارے بارے میں زبان پر لاتی تو پتہ نہیں کتنی بھیانک آگ لگ جاتی خاص کر اُس صورت حال میں جب مذہب پر سیاسی رنگ چڑھ چکا تھا۔ اُس کے بعد جب بچوں کی فکر دور ہوئی اور مجھے کچھ سکون میسر آیا تو میں نے سوچا کہ اب میں ایک ودھوا آپ کی آسودہ زندگی میں کیوں اپنی بھولی بسری یاد تازہ کر کے رنگ میں بھنگ ڈالوں اس لیے سینے پر پتھر رکھ کر خاموش اپنے دل کے زخموں کو سیتی رہی۔

میری بھی پوری روداد سن کر آخر پر اُس نے اچانک سوال کیا۔

''ارے میں نے تو آپ کی بیوی اور بچوں کے بارے میں کچھ پوچھا ہی نہیں۔ میں بھی کتنی بھلکڑ ہوں۔ اچھا اب بتاؤ کتنے بچے ہیں، اُن کے نام کیا ہیں اور وہ کیا کرتے ہیں''۔ اُس نے بڑی اشتیاق بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے ایک تلخ مگر استہزائیہ ہنسی کے ساتھ کہا۔

''بچے_____بچے کہاں سے آتے جب میں نے شادی ہی نہیں کی''۔



مجروح سازِ دل

رنج، غم، درد، الم، یاس، تمنا، حسرت
اک تیری یاد کے ہونے سے ہے کیا کیا دل میں
(جوشؔ ملسیانی)

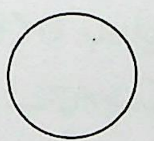
مجروح سازِ دل

شاعرہ یمن کی تھی۔ گرچہ وہ عربی زبان میں کہتی تھی مگر اُس کی تخلیقات بشمول اُردو دنیا کی تقریباً ہر بڑی زبان میں ترجمہ ہو کر ملکوں ملکوں رسائل و جرائد میں شائد ہوتی رہتی تھیں۔ وہ کئی بار ہندوستان بھی آچکی تھی مگر مشکل یہ آن کھڑی ہوئی کہ یہاں کا ایک بہت بڑا نامور شاعر اُس کی زلف گیر کا اسیر ہو گیا۔ دونوں کی کئی بار گرچہ رسمی ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ مگر شاعر کسی بھی موقعہ پر اپنے دل کی بات زبان پر لانے کی جرأت نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے محبت کا یہ روگ اندر ہی اندر پالا اور اس کوفت سے نجات پانے اور اس سے توجہ ہٹانے کے لیے شراب کا جھوٹا سہارا لیا۔ اس طرح سے کثرت شراب نوشی نے صحت کو کھا ڈالا اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد شاعر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ مگر مرنے سے قبل اُس نے اپنے چند خاص دوستوں سے یہ وعدہ لیا کہ چاہے جس طرح سے بھی ممکن ہو اُس کا لکھا ہوا ایک خط انگریزی یا عربی میں ترجمہ کر کے شاعرہ تک ضرور پہنچا دیا جائے۔

حسبِ وصیت ایسا ہی کیا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد شاعر کا درد و کرب کی دُہائی دیتا ہوا وہ خط دنیا بھر کے مقتدر جرائد و رسائل میں مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوا۔ خط دردِ دل کی ایک ایسی غمزدہ عشقیہ داستان تھی جو ہر پڑھنے والے کو متاثر کئے بنا نہیں رہتی تھی، دل پر ہاتھ ڈالتی اور اشکبار کرتی تھی۔ خط کے اختتام کے بعد اضافت میں نوٹ کی صورت میں ایک جملہ تحریر تھا۔

کاش یہ خط تم نے مجھے اپنی زندگی میں بھیجا ہوتا میں اپنے آپ کو تم پر نثار کرتی ______ خالدہ

❖❖❖



اُس نے کہا تھا

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی
یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا
(بشیر بدر)

اُس نے کہا تھا

وہ ایک ہندو لڑکی تھی اُس کا نام وجے تھا______

وہ اپنے محلے کے ایک غریب مسلمان لڑکے کے ساتھ پیار کرتی تھی جو میرا دوست، میرا ہم نوالہ، ہم پیالہ بلکہ راز دار بھی تھا۔ لڑکی اُسے بے حد چاہتی تھی اور لڑکا بھی دل و جان کے ساتھ اُس پر فدا تھا۔ بچپن میں دوستی ہو گئی تھی، دونوں ہمسائیگی میں رہتے تھے بلکہ ساتھ کھیلتے بھی تھے۔ شروع میں ہی دونوں کے دلوں میں پیار کی ایک کلی پھوٹی تھی جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ایک خوش رنگ و خوش نما پھول میں تبدیل ہو گئی۔ وہ بڑھتے رہے، عمریں پختہ ہوتی گئیں اور پیار پروان چڑھتا رہا۔ دن کے دوران گلی محلے میں، سڑک پر وہ لوگوں کے ڈر سے ملنے میں احتراز کرتے مگر راتوں کو وہ ہر دوسری تیسری رات کو ملا کرتے تھے۔ تقریباً پوری رات باتوں میں بِتاتے اور لگ بھگ فجر کے وقت بوجھل آنکھوں کے ساتھ ملنے کی دوبارہ چاہت لئے، پیار ے میں ثابت قدم رہنے کے وعدوں کے ساتھ وہ ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتے تھے۔

یہ پیار بھی کیا کیا حرکتیں کرواتا ہے۔ ملنے کا انہوں نے ایک ایسا طریقہ اپنایا تھا جو شاید اُس سے قبل اور اُس کے مابعد بھی کسی کے ذہن میں پیدا نہیں ہوا ہوگا۔ وجے کو جس دن لگتا کہ اُس رات وہ اپنے محبوب سے مل سکتی ہے وہ لڑکے کے صحن میں شام ڈھلے یا رات کو ایک دو بار کنکری پھینکتی تھی۔ چونکہ دونوں کے صحن ملے ہوئے تھے اور لڑکے کے صحن میں پتھر کی سلیں بچھی ہوئی تھیں اس لیے کنکری کی آواز صاف سنائی دیتی تھی اور لڑکا سگنل سمجھ جاتا

تھا۔ جواب میں وہ اپنے کمرے کی بجلی دو تین بار جلاتا بجھاتا تھا۔ ویسے بھی وہ اپنے کمرے کی کھڑکی پر تقریباً ہر شام کو رات گئے تک اُس مخصوص سگنل کا منتظر رہتا تھا۔

دونوں ملتے، والہانہ ملتے جیسے پہلی بار مدت کے بعد ملے ہوں۔ وجے نے لڑکے کو سچ مچ ہی پراجے کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ پیار میں ساری سُدھ بُدھ کھو بیٹھا تھا، صرف وجے کا ہی تصور اُس کے ہر تصور پر چھایا ہوا تھا۔ دن گذرتے گئے۔ بہاریں خزانوں میں اور خزان جاڑوں میں اور جاڑے دوبارہ بہاروں میں تبدیل ہوتے گئے۔ دونوں تعلیم مکمل کر کے روزی روٹی سے جُڑ گئے۔ وجے محکمہ تعلیم میں اُستانی اور لڑکا ایک سرکاری دفتر میں ملازم ہو گیا۔ عملی زندگی میں آگے قدم بڑھانے کا وقت آ گیا۔ لڑکے نے وجے کے سامنے شادی کا پرستاؤ رکھا مگر لڑکی نے بے انتہا پیار کے باوجود بھی شادی سے انکار کر دیا اور لڑکا ہکا بکا رہ گیا۔ حیرانگی سے وجہ پوچھنے پر لڑکی نے جواب میں کہا:

''میری دو بہنیں اور ایک بھائی ہے جو مجھ سے چھوٹے ہیں۔ اگر میں نے اپنے سماج کے ساتھ بغاوت کی تو اُس کا خمیازہ میرے بھائی بہنوں کو بھگتنا پڑے گا۔ اُنہیں ہندو سماج نفرت کی نگاہ سے دیکھے گا گرچہ وہ بے قصور ہوں گے مگر میرا قصور اُن کا قصور ٹھہرے گا۔ اُن کی شادی تو دور کی بات اُن کو سماج میں دھتکار ہی ملے گی۔ اگر میں تمہارے ساتھ شادی کرتی ہوں تو ایک زندگی بنتی ہے مگر کیا ایک زندگی کو بنانے کے لیے ہم تین زندگیوں میں زہر گھولیں گے۔ میرا خیال ہے کہ خود غرض تم بھی نہیں ہو اور ایسا تم بھی نہیں چاہو گے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا پیار سچا ہے، بے غرض ہے۔ ہم شادی نہ کر کے بچھڑیں گے نہیں بلکہ ملتے رہیں گے اسی طرح اب بھی ___ اس جنم میں

بھی ــــــ اور اگلے جنم میں بھی ــــــ بھلے سے ہمارے شریر نہ مل پائے مگر ہماری آتمائیں تو مل چکی ہیں، ایک دوسرے میں سما چکی ہیں۔ وہ ملتی رہیں گی ــــــ ہمیشہ ہمیشہ ــــــ ہر جنم میں ــــــ جنم جنم کے پھیروں میں ــــــ

لڑکے سے اب برداشت نہ ہو سکا۔ اُس نے لڑکی کی بات کاٹ کر ٹوک دیا۔

"مگر وہ پیار کے وعدے ــــــ قول و قرار ــــــ اور مرنے جینے کی قسمیں۔ کیا وہ سب ڈھونگ تھا ــــــ"۔

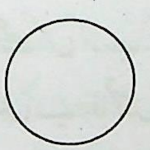
"نہیں تمہیں کیا لگتا ہے مجھے اس بات کا کوئی دُکھ نہیں۔ یہ میں ہی جانتی ہوں کہ اپنی بات بتانے میں مجھے کس کرب سے گذرنا پڑا ہے۔ اپنے دل کو مجھے کس قدر سخت کرنا پڑا ہے۔ میں بے وفا نہیں مجبور ہوں"۔

اُس کے بعد لڑکا کچھ نہ بولا صرف ایک آہ بھر کر رہ گیا۔ وہ اُٹھا اور چپ چاپ بغیر کچھ کہے چلا گیا۔ اُسے لگا جیسے اُس کو کسی نے پہاڑ کی اونچی چوٹی سے نیچے کھائی میں دھکیل دیا ہو اور وہ بکھر گیا ــــــ کرچی کرچی ہو گیا۔

اُس واقعے کے بعد وہ مجھے مہینوں بلکہ برسوں کے بعد ہی دکھائی دیتا۔ آخری عمر میں وہ باورا ہو گیا اور صرف یہی کہتا پھرتا تھا ــــــ

"اُس نے کہا تھا ــــــ"





نیا سماج

کس پر بھروسہ کیجئے راہِ حیات میں
رہزن بنے ہوئے ہیں نگہبان ان دنوں
(حفیظؔ بنارسی)

نیا سماج

کاشی پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں آموں کے ایک باغ میں دو جوان دل دھڑک رہے تھے۔ دنیا و مافیہا سے دور، اپنی ہی دنیا کے آپ باسی، ہر ایک چیز سے بے نیاز، قریب قریب بیٹھے پیار کی سرگوشیوں میں گُم، میٹھے خوشبوؤں میں بسی دل کی دنیا سجائے۔

شام کے دھندلکے رات کی تاریکیوں میں گُم ہونے لگے تھے۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ پیلی پیلی مدھم روشنی میں پیڑوں کے لمبے، سایوں نے اندھیرا سا کر رکھا تھا۔ دور سے دیکھنے پر وہ کسی کو نظر نہیں آسکتے تھے۔ آم کے پیڑوں پر بور آچکا تھا۔ ایک ہلکی سی خوشبو فضا میں رچی بسی تھی اور بہار کے رسیلے رنگیلے دنوں نے ماحول کو اور بھی مست، مدہوش اور رومانی بنا دیا تھا۔

''چندا! کیا سوچ رہی ہو۔ کن خیالوں میں کھوئی ہو، کیا کوئی الجھن، کوئی پریشانی ہے تو بتا دو، میں ہوں نا''۔

اس سے بڑھ کر اُلجھن اور کیا ہوسکتی ہے کہ اگر ہمارے میل ملاپ کے بارے میں کسی کو پتہ چل گیا تو ہمارے خاندان کا گاؤں سے نکالا تو یقینی ہے اور رُسوائی سے الگ۔ اور یہ پریشانی کیا کم ہے کہ ہم مل کر بھی مل نہیں سکتے۔ ایک ہو کر بھی ہماری شادی نہیں ہوسکتی کیونکہ تم اونچی ذات سے تعلق رکھتے ہو اور میں ______

پرکاش نے اُس کی بات بیچ میں کاٹ کر کہا: ''تو یہ کون سی پریشانی کی بات ہے۔ ہم یہاں سے دور کہیں اور چلے جاتے ہیں اپنی ایک الگ دنیا بسانے۔ جہاں ذات برادری کے جھگڑے اور سماجی گٹھ بندھن نہیں ہوں

گے۔ ہماری اپنی دنیا ہوگی، ایک چھوٹا سا گھر ہوگا، اپنا سماج ہوگا۔ ہم تم مل جل کر ایک نئے سماج کی روپ ریکھا ڈالیں گے، ایک نئی دنیا بسائیں گے_____ اپنی دنیا_____ اپنے پیار کی دنیا_____

"مگر"_____ چندا نے کچھ کہنا چاہا۔

"کچھ اگر مگر نہیں_____ بس"_____ پرکاش نے پھر اُس کی بات کاٹی۔

پورے ایک سال کے بعد پرکاش گاؤں واپس لوٹ آیا۔ اپنی ذات برادری اور خاص طور پر اپنے گھر والوں نے اُسے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ وہ نہ صرف خود اچھے کپڑوں میں ملبوس تھا بلکہ اُس کے ساتھ اور بھی دو تین وزنی سوٹ کیس تھے۔ اُس نے غیر حاضری کا سبب کام دھندے کی تلاش بتایا۔ ماں کے سوا گھر میں اور کوئی پوچھنے والا تھا نہیں، اس لیے بات آئی گئی ہوگئی۔ ماں کے لیے یہی کیا کم تھا کہ اُس کا بیٹا لوٹ کر آیا ہے۔

دو تین روز کے بعد شام ڈھلے چوپال پر کاش کے ایک دوست نے اِدھر اُدھر کی دو چار باتوں کے بعد چندا کا ذکر چھیڑ دیا۔ پرکاش نے سنجیدہ لہجہ اختیار کر کے بڑی معصوم سی صورت بنا کر کہا:

اچھا تو وہ بھاگ گئی مگر کب_____ کس کے ساتھ_____ بڑی اچھی لڑکی تھی_____ ویسی تو نہیں لگ رہی تھی_____ ہاں بھئی ویسے بھی کسی کے من میں کیا ہے وہ پتہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے"۔

❖❖❖

درد کا رشتہ

گذرتے وقت کی ہر چاپ سے میں ڈرتا ہوں
نہ جانے کون سا لمحہ اُداس کر جائے
(مشفق خواجہ)

دردکا رشتہ

ہمارے دونوں ساتھی بڑے ہی من موجی طبیعت کے مالک ہیں۔ ہمیشہ عجیب و غریب حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ ابھی چند روز قبل اُنہوں نے فیصلہ کرلیا کہ ایک رات ریگستان میں گذاری جائے۔ ویسے وہ جب بھی کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں، مجھے اُس میں شامل نہیں کرتے، صرف فیصلے کی عمل آوری میں مجھے ساتھ دینا پڑتا ہے۔ فیصلہ ہوا، پروگرام بنا اور مقررہ دن کو ہم صحرا کی جانب صحرانوردی کرنے کے لیے چل پڑے۔ شہر سے لگ بھگ سو کلومیٹر دور ریگستان میں ایک مرتفع سی جگہ پر ہم نے اپنا سفری خیمہ نصب کر دیا اور اپنی اپنی دلچسپی کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔

رات کو جب میرے دونوں ہمرکاب سو گئے تو میں یہ دیکھنے کے لیے کہ باہر کا ماحول کیسا لگتا ہے خیمے سے باہر آیا۔ بارہویں یا تیرہویں کا چاند چمک رہا تھا۔ ہر سُو چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ شفاف ریت کے ذروں پر پڑنے والی چاندنی سے لگ رہا تھا کہ جیسے یہ صحرا نقرئی پانیوں کی ایک بہت بڑی جھیل ہے۔ سیمیں پانی کا یہ سمندر حد نگاہ تک نظر آ رہا تھا۔ ہر سُو خاموشی تھی ـــــــ مکمل سکوت۔ ٹھنڈی ہوا کے بہنے کے سوا اور کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ حشرات الارض بھی شاید خُنک چاندنی کا حظ اٹھا رہے تھے۔ میں اس نقرئی صحرا میں سحر زدہ سا ہو گیا۔ بہت دور تک چلنے کے بعد جب میں لگ بھگ تھک چکا تھا میں نے ایک میٹھی سی درد بھری آواز سنی۔ کوئی ملتجی لہجہ فریاد کر رہا تھا

ع ڈاچی والیا موڑ مہار وے

(اے دور جانے والے میرے محبوب اونٹنی کی لگام کو موڑ

دے ــــــ لوٹ آ ــــــ واپس آ جا)۔

کھلی جگہ جہاں آسمان بھی ریگستان کے کناروں کو چھوتا ہوا نظر آ رہا تھا اور یکسان ماحول یہ معلوم نہیں پڑ رہا تھا کہ آواز صحیح صحیح کہاں سے آ رہی ہے مگر کان لگا کر اور سمت کا اندازہ کر کے میں ایک طرف کو چل پڑا۔ میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ ایک ریتلے ٹیلے کی دوسری جانب میں نے ایک چھوٹا سا تنبو نصب دیکھا۔ تنبو کے اندر روشنی ہو رہی تھی مگر باہر اُس کے قریب ایک لمبی سی موٹر کار کھڑی تھی جس کے بونٹ پر کوئی نیم دراز شخص ہلکے سروں میں گٹار بجا رہا تھا اور چکور کی طرح اپنی درد بھری صداؤں سے صحرا کو رُلا رہا تھا۔

مُبادا کوئی گڑ بڑ نہ ہو جائے۔ مغنی چونک نہ پڑے، ڈر نہ جائے، اُس کا گیت ٹوٹ نہ جائے، صدا بکھر نہ جائے، سنگیت ڈوب نہ جائے اس لیے میں اُس کے سامنے والی طرف سے اُس کی جانب بڑھنے لگا۔ آہستہ آہستہ بغیر آہٹ کئے تاکہ گیت سے محظوظ ہو سکوں۔ نغمے سے پھوٹنے والے درد کو اپنے آپ میں مدغم کر سکوں۔ جب میں اُس کے بالکل قریب پہنچ گیا تو میں رُکا ــــــ وہ ٹھٹھکا ــــــ اُس کی انگلیاں ساز سے جُدا ہو گئیں ــــــ گیت ٹوٹا ــــــ نغمہ بکھر گیا ــــــ التجائیں سر پھوڑنے لگیں ــــــ میں سنبھلا ــــــ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ ایک دراز قد نوجوان تھا جس کے چہرے کے تاثرات میں پڑھ نہ سکا کیونکہ چاندنی چہرے کو کتابی چہرہ بنانے کے لِیے ناکافی تھی۔ اُس نے میرا بھرپور جائزہ لے کر ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا:

"اجنبی تم کون ہو ــــــ کیا چاہتے ہو ــــــ یہاں کیوں آئے ہو"۔

''تم نے میرا نام خود ہی بتا دیا____ اجنبی____ میں نے تمہارے درد کو سنا۔ میں درد کو دیکھنے، درد کو سننے اور درد کو محسوس کرنے کے لیے آیا ہوں۔ مجھے تمہاری درد بھری آواز نے آواز دی ہے۔ مجھے اس درد میں چھپی کسک نے بلایا ہے۔ نہ یہ تڑپتی، نہ میں سنتا، نہ یہاں چلا آتا۔ آخر تم کو کس درد نے مارا ہے۔ تم کیوں بھٹک رہے ہو۔ کس لیے صحرا نوردی کر رہے ہو''۔

''میں تنہائیوں سے ہمکنار ہونے آیا ہوں۔ سکون وسکوت کا طالب ہوں۔ میرے پاس کیا ہے۔ میں تجھے کیا دے سکتا ہوں اپنی آشفتہ بیانی کے سوا''۔

''معلوم نہیں مگر یہ اتفاق نہیں ہوسکتا۔ کوئی بات ہے جو مجھے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ جس طرح دو ہم مشرب بغیر اتفاق کے بھی مل جاتے ہیں اُسی طرح دو ہم خیال، دو ''ہم درد'' بھی کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ مل ہی جاتے ہیں۔ ویسے تو میں نے یہی سنا ہے کہ درد جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو دوا ہو جاتا ہے''۔

''ہاں اجنبی تم نے صحیح سنا ہے۔ درد جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو دوا بن جاتا ہے۔ اُس میں گھٹن، چُبھن اور ٹیس نہیں رہتی۔ جب ناسور رستا نہ رہ جائے تو وہ ناسور نہیں کہلاتا۔ درد عمیق ہوتا ہے____ بے انتہا____ لامحدود____

درد کی دنیا ہی نرالی ہوتی ہے۔ زندگی کا دوسرا نام ہی درد ہے۔ کوئی اسے محسوس کرتا ہے، کوئی نہیں کرتا۔ کوئی اسے پالیتا ہے، کوئی نہیں پاتا۔ جو اِسے پاتا ہے مانو وہ امر ہوگیا۔ درد ہی جینے کا حوصلہ ہے۔ درد ہی جینے کے لیے

صدائے جرس ہے۔ درد ہی دوا ہے، درد ہی دُعا ہے، درد ہی زندگی ہے اور زندگی ہی درد ہے''۔

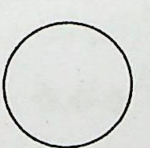
''میں سن رہا ہوں میرے دوست۔ مجھے تمہاری باتیں اچھی لگ رہی ہیں۔ کچھ اور بتاؤ'' ______

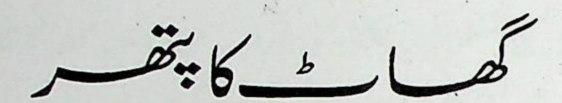
''ہاں! اچھی اس لیے لگ رہی ہیں کہ اِن میں درد ہے۔ درد سے ہی دنیا کا وجود ہے۔ درد سے ہی دنیا قائم ہے۔ درد سے ہی بستیاں بستی ہیں۔ ویرانے آباد ہو جاتے ہیں۔ درد سے بچے پلتے ہیں۔ درد سے ہی بچوں کی محبت جاگتی ہے اور بزرگوں کی عزت ہوتی ہے۔ درد سے ہی نظام حیات اور کاروبار دنیا کے کل پُرزے متحرک ہوتے ہیں۔ اور یہ اُسی درد کی حشر سامانیاں ہیں جو تم اس وقت، رات کو، انجان دشاؤں میں، ریگستانی پُر ہول سناٹے میں صحرا نوردی پر مجبور ہو اور میری مجلس میں شاگردوں کی طرح بیٹھے طلب گار نگاہوں سے میرے درد کی انتہا ناپنے کی کوشش کر رہے ہو۔ میرے درد کا احاطہ کرنا چاہتے ہو۔ مگر لامحیط کا احاطہ کیا، لا انتہا کی سرحد کہاں، لامحدود کی حد کیسی؟ جاؤ اجنبی جاؤ، اپنی منزل کو پکڑو، درد کے ساتھ رشتہ قائم رکھو۔ تمہاری زندگی سنور جائے گی۔ درد ہے تو انسانی خدمت سرانجام دی جا سکتی ہے۔ انسانی خدمت سب سے بڑی عبادت ہے۔ آج کا انسان رنجیدہ بھی ہے اور الم زدہ بھی۔ اُسے خدمت، مروت اور دلجوئی کی ضرورت ہے۔ یاد رکھو درد سے قُرب بڑھتا ہے ______ قُرب سے پیار جاگتا ہے ______ پیار سے محبت پیدا ہوتی ہے اور محبت سے عشق جنم لیتا ہے۔ انسانی خدمت ہی عشق کی انتہا ہے۔

آزمائش شرط ہے۔ عمل کر کے دیکھو۔ اگر تم یتیموں، بیواؤں، مسکینوں،

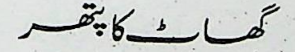
معذوروں، دردمندوں اور ضعیفوں کے چہروں پر ایک بھی مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہوسکو تو مانو تمہیں تمہاری منزل مل گئی۔ زندگی کا مقصد پورا ہوگیا۔ پھر اور کیا چاہیے۔ جنت اور جہنم تمہارے اپنے وجود کے اندر مقید ہیں۔ درد کو جگاؤ تو ہر طرف جلوہ سامانیاں اور رنگین فضائیں سایہ فگن ہوں گی، نہ جگاؤ تو غم واندوہ کے وڈیرے تمہارے جینا حرام کردیں گے۔ جاؤ اجنبی جاؤ______ لوٹ جاؤ______ اپنی منزل کا رُخ کرو۔ اپنی دنیا میں جاؤ۔ اپنے لوگوں کے پاس جاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی درد بھرا دل تمہاری راہ دیکھ رہا ہو۔ کسی غم زدہ دل کو تمہاری ضرورت ہو۔ میری باتوں پر غور کرنا اور اگر ہوسکے تو انہیں سمجھنے کی کوشش کرنا۔ جاؤ______ الوداع۔







جہاں پر زخم دکھانا گناہ ٹھہرا
وہاں پر جرم کا کس طرح احتساب کریں
(یوسف اعظمی)


گھاٹ کا پتھر

ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ جی ہاں ایک بڑا ہنگامہ۔ جس نے بھی سنا اُس کے ماتھے پر بل پڑ گئے، تمسخر اُڑایا، پھبتی کسی اور اس ''غیر شائستہ'' اور ''ناشائستہ'' قدم کے لیے برجیس کو ہدف ملامت بنایا۔ مگر ایسا کیوں ہوا اُس کے بارے میں اصلیت سے سب نے چشم پوشی کی۔ برجیسؔ کے دل سے اٹھنے والے جذبات اور خدشات کو کسی نے بھی محسوس نہ کیا اور نہ ہی اس معاملے پر بات کرنے کا حوصلہ دکھایا اور نہ ہی یہ جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی کہ ایک باہوش و حواس بالغ لڑکی جو نہ صرف پڑھی لکھی تھی بلکہ برسرِ روزگار بھی تھی_____ نے اگر ایسا فیصلہ لیا تو اُس کی کوئی وجہ بھی ہو سکتی ہے۔

برجیس کے والد ڈاکٹر تھے اور زندگی کے پُر بہار دور میں جب اُس کی وفات ہوئی وہ مشکل سے چالیس برس کے تھے۔ اپنے پیچھے ایک جوان بیوہ کے ساتھ چار لڑکیاں اور ایک لڑکا چھوڑ کر راہئ ملک عدم ہوئے۔ اتفاق سے بچوں کے دادا حیات تھے۔ انہوں نے اپنی پینشن سے بچوں اور بہو کی ضروریات پوری کرنے کے ساتھ ساتھ بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف بھی دھیان دیا۔ بچے جب بڑے ہو گئے اور دوڑ دھوپ کرنے کے قابل ہو گئے تو دادا کا بھی انتقال ہو گیا۔ گھر کی ساری ذمہ داری ماں کے کندھوں پر آ پڑی۔ چونکہ برجیسؔ بچوں میں بڑی تھی اس لیے پڑھائی مکمل کرنے کے بعد وہ ایک باحوصلہ مرد کی طرح میدانِ عمل میں کود پڑی۔ گھر کی ساری ذمہ داریاں سنبھالیں اور تحریری امتحان پاس کر کے ایک بنک کی ملازمت اختیار کر لی۔ بعد میں اُس نے دوسرے بھائی بہنوں کے لیے تگ و دَو شروع کر دی اور ایک

ایک کر کے تینوں بہنوں اور بھائی کے لیے نوکری کے آڈر قدمے، سخنے، درمے کے اصول کو اپنا کر حاصل کر لیئے۔ اس طرح سے اُن کو بھی سماج میں اپنی پہچان حاصل ہوگئی۔ چونکہ والدہ دائمی مریضہ ہوگئی تھی اس لیے گھر کے معاملات طے کرنے میں برجیس کی شخصیت ہی نمایاں تھی۔

معاشی اور مالی اعتبار سے گھر کو مستحکم کرنے کے بعد برجیس نے دوسرے معاملات کے بارے میں بھی سوچنا شروع کیا۔ اولاً اپنے سے چھوٹی ایک بہن کی شادی ایک بہت اچھی فیملی میں کرڈالی۔ دوسری اور تیسری بہن نے اپنی پسند کا برخود تلاش کرلیا جس کے لیے برجیس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کیونکہ لڑکے اچھی فیملیوں سے تھے اور اچھی پوسٹوں پر بھی تعینات تھے۔ اور پھر چند سال کے بعد جب بھائی جو بہنوں سے چھوٹا تھا، نے بھی اپنی سماجی پوزیشن اور آفیشل عزت و وقار کو مستحکم کرڈالا تو اس کی بھی ایک صاحب ثروت گھرانے میں شادی کرڈالی اور یوں وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوئی۔

برجیس کے بارے میں کسی نے نہیں سوچا۔ وہ جیسی تھی، ویسی ہی رہی۔ بھائی بہنوں کی شادی ہوگئی۔ انہوں نے اپنے اپنے گھر بار سنبھال لئے۔ اُن کے بچے ہوئے ــــــ بچے سکول جانے لگے مگر برجیس کے بارے میں اُن میں سے کسی نے نہیں سوچا۔ بیمار ماں اپنی بیماریوں کے ساتھ جھوجتی رہی، بھائی بہن اپنے گھروں، اپنے بچوں اور اپنے ازواج کے ساتھ مست ہوگئے۔ مگر اُس تنہا لڑکی کے بارے میں کسی کے پاس سوچنے کے لیے وقت تھا نہ فرصت۔ اُس کی تنہائی اور اُس کا کرب بانٹنے کے لیے، اُس بارے میں غور کرنے کے کوئی آگے آنے کے لیے تیار ہی نہ ہوا۔ اُس نے بھائی بہنوں کے گھر بسائے مگر خود وہ وہیں گھاٹ کے پتھر کی طرح حالات کے

پانیوں سے تھپیڑے کھاتی رہی۔

برجیسؔ بھی گوشت پوست کی ایک انسان تھی اور اُس کے پاس بھی ایک دھڑکتا ہوا دل تھا۔ دل میں ارمان تھے، جذبات تھے، خواہشات تھیں، اُمنگیں اور آرزوئیں تھیں۔ وہ کیا سوچتی ہے، وہ کیا چاہتی ہے ____ ظاہر ہے کہ اُسے بھی ایک پیار کرنے والا رفیق اور شفیق، ہمسفر چاہیے تھا۔ اُسے بھی ایک گھر کی ضرورت تھی۔ وہ بھی اپنے آنگن میں بچوں کی کلکاریاں، مستیاں، شرارتیں اور ہنگامے چاہتی تھی۔ ایسا تب ممکن تھا جب گھر کا کوئی فیملی ممبر، یا رشتے میں کوئی بڑا بزرگ اس بارے میں کوئی پیش قدمی کرتا مگر اس کے برعکس اُس کے ساتھ ترکِ موالات کر کے اُس کی انا کو ٹھیس پہنچائی گئی۔ اُس کی نسوانیت کو حقارت بھری نظروں سے دیکھا گیا اور اُسے بے عزت کیا گیا۔

برجیسؔ ایک گھاٹ کا پتھر ہو کے رہ گئی۔ ساگر کی لہریں آ آ کر اس پتھر کو کچوکے لگاتی رہیں۔ پتھر چیختا چلاتا رہا مگر اُس کی آواز بپھرے پانیوں کے شور کے ساتھ ہی معدوم ہوتی گئی۔ موسموں کے سرد و گرم بھی برجیسؔ کو تڑپاتے رہے، ترساتے رہے۔ وہ آہ و زاری کرتی رہی مگر اُس کی آواز مطلب و خود غرض بہرے کانوں تک نہیں پہنچ پاتی تھی۔ حالات کی ستم ظریفیاں اُسے تاک تاک نشانہ بناتی رہیں۔ اُس کی عمر امر بیل کی طرح آگے ہی آگے کو بڑھتی رہی مگر غمزدہ دل کے راستے ناسور سے ٹپکنے والے یاس و حسرت سے بھرے خون کے قطرے بہہ کر نامرادی کے عمیق غاروں میں کھوتے رہے۔ انتظار کرنے والی آنکھوں سے بہنے والے آنسو نمودار ہوتے تو تھے مگر ان دیکھی دشاؤں کی جانب بکھر جاتے تھے کیونکہ اُن کی قدر و قیمت جاننے والا کوئی تھا ہی نہیں۔ خواہشیں بے سر و سامان ہوتی رہیں، ولولوں کا دم گھٹنے لگا،

نامرادی اور ناکامی کے گہرے سائے چاروں طرف سے آکر اُس کا گلا گھونٹنے لگیں۔ خود غرض دنیا اور مطلبی رشتہ داروں سے اُسے ایک خوف سا محسوس ہونے لگا۔ اُسے اُن کے ساتھ ایک نفرت سی ہونے لگی۔ ایک ایسی نفرت جس کی جڑیں دل و دماغ میں کافی گہرائی تک سرایت کر گئیں تھیں۔ اب اُس کے سامنے فقط ایک دوراہا تھا۔

برجیس نے پھر وہی کیا جو اُسے کرنا چاہیے تھا۔ ایک صحیح فیصلہ، ایک نپا تلا قدم، ایک جامع اور مثبت پیش رفت۔ اُس نے شادی کر ڈالی، ایک ایسے مرد کے ساتھ جو پہلے سے ہی شادی شدہ تھا۔ حالات کے پیش نظر اُس نے اپنی دنیا خود آباد کر کے شاید کوئی غلط کام نہیں کیا، کوئی گناہ نہیں کیا۔ کوئی جرم نہیں کیا۔



اندھیرے اُجالے

اک ذرا سی دیر کو اُبھرا تھا آفتابِ نو
زلف کسی کی کیا کھلی، صبح کو شام کردیا
(احمد ظفرؔ)

اندھیرے اُجالے

نرملاؔ کے گھر سے صرف پانچ گھر دور سُنیل کا گھر تھا۔ نرملاؔ نے گریجویشن مکمل کر لی تھی اور اب وہ بی ایڈ میں جانے کی سوچ رہی تھی اور سُنیل نے ایم اے کی ڈگری لی تھی۔ اُس کی قسمت اچھی تھی، رزلٹ آنے کے چند دنوں کے بعد ہی اُسے اپنے ہی شہر میں ایک مناسب ڈھنگ کی ملازمت مل گئی جسے پا کر وہ بہت خوش رہنے لگا۔ نرملاؔ اور سُنیل ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ دونوں میں کافی عرصہ سے شناسائی تھی جس نے بعد میں شدت کے پیار کی صورت اختیار کر لی تھی۔ موقعہ نکال کر وہ ایک دوسرے کے ساتھ مختلف مقامات پر ملتے تھے۔ حالانکہ اس تعلق کی خبر کچھ اور لوگوں کو بھی ہو چکی تھی۔ مگر کسی نے اعتراض کرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ ایسی باتیں کم وبیش ہر جگہ ہوتی رہتی ہیں۔ خاص طور پر ایسے ماحول میں جہاں ہر دو جنس کا ملنا جلنا آزادانہ طور پر ہوتا ہے۔

سُنیل کا ایک بھرا پُرا گھر، ایک پریوار تھا مگر اُس کے برعکس نرملاؔ کے صرف ایک بڑے بھیا، بھابی اور اُن کے دو چھوٹے بچے تھے۔ ماں باپ گاؤں میں رہنے کے دوران سیلاب میں بہہ گئے تھے۔ اس وجہ سے اُس کی کل کائنات یہی ایک چھوٹا سا پریوار تھا۔ بڑے بھیا سرکاری ملازمت میں تھے اور بھابی گھر کا کام دیکھتی تھی وہ اتنی نیک تھی کہ اُس نے کبھی نرملاؔ کو ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔

اِسی دوران بڑے بھیا کو اپنے آبائی گاؤں میں نرملاؔ کے لیے ایک بہت ہی مناسب اور معقول رشتہ ملا۔ بڑا گھر، کھاتے پیتے خوشحال لوگ تھے۔ گرچہ گھر کے سبھی لوگ مختلف کاروبار سنبھالے ہوئے تھے مگر دیپک ایک تعلیم یافتہ

انجینئر تھا۔اس لیے وہ سروس میں تھا اور کاروبار کے ساتھ اُسے ویسے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔شادی کے بعد اُس کا ارادہ شہر میں آ کر رہنے کا تھا۔

دیپک کے ماں باپ اور بھائی بہن آئے۔انہوں نے نرملا کو دیکھا۔اُن کے ساتھ دیپک نے بھی لڑکی کو پسند کیا بلکہ شادی کی تاریک بھی پکی کر لی۔اس شرط پر کہ بارات آئے گی، اُس کی تواضع صرف پانی سے ہوگئی، کوئی دعوت، کھانا پینا اور ناشتہ وغیرہ نہیں ہوگا۔اُن کا کہنا تھا کہ وہ بڑے بھیا سے ایک پالی پوسی، پڑھی لکھی لڑکی لے جارہے تھے۔اس لیے وہ بڑے بھیا پر اور کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔

اُن لوگوں کے جانے کے بعد نرملا کا بُرا حال ہوگیا۔وہ بے چینی کے ساتھ شام کا انتظار کرنے لگی۔ شام کو وہ سُنیل سے ملی اور اُسے ساری باتوں سے آگاہ کردیا۔شادی میں صرف چالیس دن باقی تھے اور اس دوران کچھ کرنا ضروری تھا۔سُنیل نے اُسے پورا بھروسہ دلایا کہ وہ اپنے گھر والوں کو بڑے بھیا سے رشتہ مانگنے کے لیے آمادہ کرے گا۔چونکہ اُس رشتے میں اُن دونوں کی مرضی شامل تھی اس لیے بڑے بھیا کو گاؤں کے رشتے سے انکار کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

اُس دن کے بعد سے سُنیل نے نرملا کے ساتھ ملنا جلنا کم کردیا۔کبھی دفتر میں کام کے سلسلے میں شہر سے باہر جانے کا بہانہ، کبھی ایک جھوٹ، کبھی دوسرا فریب اُس نے دراصل اپنے گھر والوں کے ساتھ اس ضمن میں بات کرنے کی جرأت نہیں جُٹا پائی تھی۔اُس کا پیار ابڑا ہلکا ثابت ہوا۔دراصل مرد پیار کو کھیل سمجھ کر یہ کھیل بار بار کھیلتا ہے اور عورت اِسے ایک ہی بار کر کے اپنی زندگی کا روگ بنا لیتی ہے۔عورت جانتی ہے کہ مرد اُس کے ساتھ صرف کھیلتا ہے، چھل

کرتا ہے، مگر اس کے باوجود بھی وہ اس مایا جال سے اپنے آپ کو الگ نہیں کر پاتی ہے۔

شادی کا دن آیا۔ بارات باجے گاجے کے ساتھ دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ نرملا نے اپنے سارے زیور وغیرہ سمیٹے اور پچھلے دروازے سے نکل کر سُنیل کے پاس پہنچ گئی۔ زیوروں کی پوٹلی اُس کے ہاتھوں میں تھما کر اُسے فوراً وہاں سے نکل جانے پر اصرار کرنے لگی مگر سُنیل کی سرد مہری اور بے رُخی دیکھ کر پہلی بار اُسے احساس ہوا کہ وہ غچا کھا بیٹھی ہے۔ اُس نے سُنیل کا گریبان پکڑ کر اُسے زور کا ایک جھٹکا دے کر کہا کہ اب اُس کے پاس کیا رہ گیا ہے۔ کون سی عزت باقی بچی ہے۔ میں سب کچھ چھوڑ کر تمہارے پاس آ گئی ہوں۔ سُنیل کا جواب اُس کے کانوں کے لیے نہ صرف بم کا دھماکہ تھا بلکہ پیار کا گھروندہ ڈھے جانے کا وہ جان لیوا منظر بھی جسے دل والے ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ اُس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسوؤں کی ایک دھارا بہہ نکلی جو اپنے ساتھ تمام ارمان، آرزوؤں اور سپنوں کے محل بہا کر لے گئی۔

نرملا واپس اپنے گھر لوٹ آئی۔ بارات واپس جا چکی تھی۔ تمام رشتہ دار اور مہمان یار دوست اپنے اپنے گھروں اور ٹھکانوں کو جا چکے تھے۔ گھر میں ہُو کا عالم تھا، ہر کونے کھدرے سے وحشت سی ٹپک رہی تھی۔ بجھے ہوئے منڈپ سے ہلکا ہلکا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ بڑے بھیا اور بھابی اپنے کمرے میں آنسو بہا رہے تھے۔ نرملا اپنے کمرے میں چلی گئی تو خوب آنسو بہا کر جب اُس کا من کچھ ہلکا ہوا تو بیتی باتوں کو پسِ پشت ڈال کر، کیونکہ اُس کے سوا اور کوئی چارہ کار بھی نہ تھا، وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے اور پلان بنانے لگی۔

کچھ عرصہ کے بعد بات آئی گئی ہو گئی۔ بڑے بھیا اتنے شریف انسان

تھے کہ انہوں نے کبھی اس سانحے کا ذکر یا اس بارے میں گلہ شکوہ اپنی بہن سے نہیں کیا۔ پاس پڑوس کی ہمدردیاں نرملّا کے ساتھ ہوگئیں اور سُنیل کو سب کوستے اور بُرا بھلا کہتے رہے جس وجہ سے اُس نے ٹرانسفر لے کر دوسرے شہر میں پناہ لی۔ نرملّا نے بی ایڈ کا امتحان پاس کیا۔ اُسے اپنے ہی علاقے میں ایک پرائیویٹ سکول میں نوکری مل گئی۔، وہ سکول آتی جاتی اور بس اپنے ہی کمرے تک محدود ہو کے رہ گئی۔ وہ کبھی فیملی یا بچوں کے ساتھ مکس اپ ہونا پسند نہیں کرتی تھی۔ سکول کے علاوہ اُس کی ساری سماجی زندگی نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ اُدھر دیپک جب بھی سیکرٹریٹ میں کسی دفتری کام سے آجاتا تو بڑے بھیا کے کیبن میں ضرور دو منٹ کھڑے کھڑے سلام دعا کرتا اور گھر والوں کی خیریت پوچھتا۔ بڑے بھیا شرمندگی محسوس تو کرتے تھے مگر وہ دیپک کے اس سبھاؤ اور شرافت پر حیرت زدہ تھے۔

سمئے کا پنچھی اپنے لمبے لمبے پروں سے کال کو کاٹتا ہوا آگے ہی آگے کو بھاگتا رہا یہاں تک کہ اُس غمناک واقعے کو گذرے پندرہ برس ہو گئے۔ ایک دن اتوار کی چھٹی تھی۔ سب لوگ گھر پر ہی تھے کہ دروازے پر دیپک نمودار ہوا اور اندر آنے کی اجازت چاہنے لگا۔ بڑے بھیا کے وارے نیارے ہو گئے وہ لپک کر گئے اور دیپک کو اپنے ساتھ بیٹھک میں لے آئے۔ دیپک نے بچوں کے لیے مٹھائیاں اور پھل لائے تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران بڑے بھیا نے دیپک سے کہا ـــــــ "آپ دفتر میں آتے ہیں، جلدی میں ہوتے ہیں بڑی نوازش ہے آپ کی عنایت ہے۔ وہاں بات کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ میں بے حد شرمندہ ہوں۔ ہم سے آپ کو کیا ملا مگر آپ پھر بھی ہم کو اپنا ہی تصور کرتے ہیں۔ واقعی یہ شرافت کی انتہا ہے۔"

''ارے چھوڑیئے، بھیا ایسا ہوتا رہتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں شاید مجھ میں ہی کوئی خامی یا کمی تھی اور کوئی بات کریئے''۔

''اب میں اور کیا بات کروں۔ آپ نے ہمیں کئی جنموں تک اپنے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہیں رکھا (ہاتھ جوڑ کر) اگر ہو سکے تو ہمیں معاف کرنا''۔

بڑے بھیاؔ بھی اپنی خفت مٹانے کے لیے اس رنجیدہ موضوع کو طول نہیں دینا چاہتے تھے اس لیے بات کو دوسری طرف گھُما کر لے گئے۔

''اچھا دیپک جی یہ بتایئے بچے کتنے ہیں اور کس کس کلاس میں پڑھتے ہیں''۔

دیپک تھوڑی دیر کے لیے لرز کر رہ گیا اور دوسرے کو محسوس کرائے بغیر ایک آہ بھر کر رنجیدہ خاطر ہو کر بولا۔

''بڑے بھیا جب شادی ہی نہیں ہوئی تو بچے کہاں سے آتے''۔

بڑے بھیا گنگ ہو کر رہ گئے اور بے اختیار پھوٹ کر رونے لگے۔ دیپک کو تسلی دینے کی بجائے اُلٹا دیپک ہی بڑے بھیا کو چپ کرانے میں جھٹ گئے۔

حالات نے کیا کروٹ لی یا اُن دونوں کے درمیان کیا بات چیت ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ باقی گھر والے اس سے بے خبر نہیں رہے ہوں گے ویسے بھی بڑے بھیا کا گھر کوئی حویلی تو تھا نہیں۔ کافی دیر بیٹھنے کے بعد دیپک نے جانے کی اجازت طلب کی۔ بھیا اور بچے اُسے دروازے تک چھوڑنے کے لیے ساتھ گئے۔ صحن سے باہر آکر دیپک نے یونہی غیر اختیاری طور پر اوپر بالکونی کی طرف نظریں اُٹھائیں۔ اُسے محسوس ہوا کوئی اُسے تاک رہا ہے

کیونکہ جونہی اُس کی نظریں اوپر اٹھیں پردہ برابر ہوگیا۔ دیپک کے پاؤں میں جیسے زنجیریں پڑ گئیں۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اوپر کی طرف پھر نظریں اٹھائے یا سڑک کی جانب قدم بڑھائے کہ آنکھ کی ایک جھپک میں کوئی دھم سے اُس کے قدموں کے پاس آ گرا۔ آواز گھر میں بھی سنی گئی، اس لیے بڑے بھیّا، بھابی، بچے بلکہ نزدیک کے ہمسائے بھی دوڑ پڑے مگر جتنی دور میں وہ دیپک کے پاس پہنچتے گرے پڑے وجود میں حرکت ہوئی۔ اُس نے کہنیوں کے بل ایک ہلکی سی جست بھری اور اپنے خون سے رنگے ہونٹ دیپک کے پاؤں پر رکھ دیئے۔ دیپک جلدی سے جھکا، اُس نے نرملا کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سنے:

''دیپک تم میری زندگی میں اُجالا پھیلانے آئے تھے مگر میں ہی ابھاگن تھی جو اندھیروں میں بھٹک گئی۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا''۔

اور ان ہی الفاظ کے ساتھ نرملاؔ نے دم توڑ دیا۔ اور یہ سب اتنی جلدی اور اچانک ہوگیا کہ کسی کے سمجھ میں کچھ نہ آ سکا کہ کیا ہوا یا کیا ہو رہا ہے۔ دیپک سُن ہو کے رہ گیا ــــــ



پیار کی جیت

دن گذرتا ہے اُجالوں کی توقع کرتے
رات زخموں کی مدارات میں کٹ جاتی ہے
(خورشید جامیؔ)

پیار کی جیت

اُن دنوں وہ نوجوان تھا______

اچھا خاصا، خوبرو اور صحت مند______

اپنے کاروبار کے سلسلے میں ایک روز اُسے ایک گاؤں میں جانا پڑا۔ بس سے اُتر کر کچھ راستہ پیدل بھی چلنا تھا۔ مطلوبہ گاؤں میں پہنچنے کے لیے اُسے اور تین چھوٹے چھوٹے گاؤں کے بیچ سے گذرنا تھا۔ دو گاؤں کو پیچھے چھوڑ کر جب وہ تیسرے گاؤں کے قریب پہنچا تو اُسے پیاس محسوس ہوئی۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں، کچھ فاصلے پر اُسے گھنے درختوں اور جھاڑیوں کا جھنڈ انظر آیا۔ اُس نے سوچا ہو نہ ہو وہاں چشمہ ضرور ہوگا۔ چشمے پر اُس نے ایک تنہا لڑکی کو گھڑے میں پانی بھرتے ہوئے پایا۔ وہ کھنکار کر آگے بڑھا اور صرف ایک لفظ کہہ کر اپنا مطلب بیان کیا______

''پانی''______

لڑکی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جب پانی پلانے کے لیے اُسے کوئی چیز نظر نہیں آئی تو اُس نے اپنی نظریں جھکائے ہی کہا:

''آپ ہاتھوں کا چلو بنایئے میں گھڑے سے پانی ڈالوں گی۔ یہاں پانی پلانے کے لیے کوئی برتن موجود نہیں ہے''۔

وہ خاموشی کے ساتھ آکر لڑکی کے سامنے جھک کر کھڑا ہو گیا اور لڑکی کا ڈالتا ہوا پانی پیتا رہا۔ سیر ہو کر اُس نے سر کے اشارے سے بس کہہ دیا۔ رومال سے ہاتھ اور منہ پونچھ کر اُس نے شکریہ ادا کرنے کے لیے لڑکی کی طرف نظریں اُٹھائیں تو اُسے لگا کہ لڑکی بھی ایک ٹک اُسے ہی دیکھے جا رہی

تھی۔ وہ ٹھٹھکا اور ٹھٹھک کر ہی رہ گیا۔ کیونکہ جونہی اُس کی نظریں لڑکی نظروں سے چار ہوئیں، اُسے لگا کہ کچھ ہو گیا۔ دل کی بستی کی کوئی دیوار ایک دم آن گری۔ ایک تیر جیسا آ کر دل کے آر پار ہو گیا۔ اُسے شکریہ ادا کرنے کا بھی یارا نہ رہا۔ یہ اُس کی جانب اور وہ اس کی طرف بس دیکھتے رہے۔ صدیاں بیت گئیں، جو صدیوں میں کہنا تھا وہ لمحوں نے ہی سنا کر مختصر کر دیا۔ خاموشی بھی ایک زبان ہوتی ہے اور اسی خاموشی نے گویائی کی کسر پوری کر دی۔

دور کوئی گھوڑا ہنہنایا_____ وہ چونکی_____ یہ جاگا_____ سحر ٹوٹا_____ صدیاں واپس لوٹ کر آ گئیں_____ لمحوں کی رفتار بڑھ گئی_____ وقت نے سانس لی_____ بڑی بڑی کشادہ اور لمبی ہرنی جیسی آنکھیں حیا سے جھک گئیں۔ گلابی ہونٹوں پر ایک کلی کھِل اُٹھی۔ نوجوان نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ کسی کے آنے کی چاپ سنائی دی اور وہ منہ پونچھتا ہوا اپنی راہ پر ہولیا۔ دل کی دل میں ہی رہ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ مُڑ مُڑ کر دیکھتا رہا۔ درختوں کے ایک جھُنڈ کے پاس پگڈنڈی ایک طرف کو مُڑ جاتی تھی۔ اس لیے وہ ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ دونوں اپنی اپنی راہ پر ہو لئے، ایک اُمید، ایک درد، ایک تڑپ اور ایک میٹھی کسک ہمراہ لئے ہوئے۔

یہ کیسی نزدیکی تھی۔ یہ کیسا پیار تھا جس نے قُرب چاہا نہ ساتھ مانگا اور نہ ہی وقت طلب کیا۔ سب کچھ بہت جلدی میں ہو گیا، نگاہوں نے ہی وقت کے دھارے سمیٹ لیے۔ مدتوں کے فیصلے چند ثانیوں میں ہی طے ہو گئے۔

گاؤں میں اپنے مطلوبہ کام کے سلسلے میں اُسے دو دن لگے۔ تیسرے دن وہ جلدی ہی گاؤں سے نکل پڑا اور چشمے پر جا کر ہی دم لیا۔ لڑکی کو تلاش

کرنے لگا مگر چشمے پر کوئی بھی متنفس موجود نہیں تھا۔ ضروری تو نہیں کہ لڑکی بھی اُسی وقت اُدھر پہنچ جاتی۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد اُسے گاؤں کی طرف سے کچھ عورتیں اور لڑکیاں چشمے کی طرف آتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ دل ہی دل میں مسرور ہوا کہ شاید وہ لڑکی بھی اُن کے ساتھ ہو مگر اُن کے قریب پہنچنے پر اُسے مایوسی ہوئی۔ لڑکیوں نے شہری بابو کو عجیب نظروں سے گھورا۔ وہ پانی بھر کر جانے لگیں تب بھی وہ وہیں ڈٹا رہا۔ ایک بڑی عمر کی لڑکی سے نہ رہا گیا، ویسے بھی موجودہ صورت حال میں تجسس کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ ''بابو آپ یہاں کیوں کھڑے ہو، کوئی کھوج خبر، پتہ راستہ معلوم کرنا چاہتے ہو''۔

''نہیں، نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میرا ایک ساتھی پیچھے رہ گیا ہے اُس نے مجھے اسی جگہ پر انتظار کرنے کو کہا ہے''۔

لڑکیاں اور عورتیں پانی سے بھرے گھڑے اور گھڑ دلیاں لے کر اپنی راہ پر چل دیں۔

جب دھوپ کی تمازت کم اور سائے لمبے ہونے لگے تو وہ مایوس ہو کر ایک لٹے ہوئے کاروان کے مسافر کی طرح واپس شہر جانے راستے پر چل دیا۔ بہت دور تک وہ وقفے وقفے سے درختوں کے جھنڈ کی طرف متلاشی نظریں دوڑاتا رہا۔ اُس کی پُر شوق نگاہیں مایوس ہو کر واپس لوٹ آئیں، یہاں تک کہ درختوں کا جھنڈ بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اُسے لگا وہ دل کی دنیا لٹا کر خالی ہاتھ شہر لوٹ رہا ہے۔

اُس کے بعد یہ اُس کا معمول ہو گیا کہ وہ ہر آٹھویں دسویں روز کوئی کام نکال فیکٹری سے کھسک جاتا اور اَن جان، بے نام محبوبہ کی گلیوں کے پھیرے لگا آتا۔ مگر لگتا تھا کہ قسمت اُسے تاک تاک نشانہ بنا رہی تھی۔ وہ ہر پھیرے پر

ایک نئی اُمید ایک نئے ولولے کے ساتھ جاتا مگر پھر مایوس ہو کر لوٹ آتا۔ وہ لڑکی دوبارہ نہ ملنی تھی نہ ملی۔

اور اس طرح سے تیس برس بیت گئے۔ اُن تیس برسوں میں اُس نے کتنے چکر لگائے، کتنی بار دیدار یار کی اُمید میں کوئے یار کے پھیرے لگائے، اُس کا شمار اب اُسے بھی یاد نہ رہا۔ اُس کے بعد وہ مایوس ہو گیا۔ وہ اکثر سوچا کرتا، ہوسکتا کہ وہ مرگئی ہو۔ ایسا ماننے کے لیے اُس کا من تیار نہیں ہو رہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اُس کی شادی کسی دوسرے گاؤں میں ہوئی ہو، ایسا ممکن ہوسکتا ہے۔ بہرحال اب اُس نے گاؤں آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ اُس کی عمر بھی اب پچاس برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ قلمیں سفید ہو چکی تھیں اور ستاروں نے بالائے سر چراغاں کرنا شروع کر دیا تھا۔ اُس کی زندگی اب ایک تثلیث میں بٹ چکی تھی۔ وہ ایک بے نام محبوبہ کی یاد دل کے نہاں خانوں میں پالتا رہا۔ ساتھ میں فیکٹری کی دیکھ بھال بھی کرتا رہا اور کچھ سماجی کاموں میں بھی حصہ لیتا تھا۔ وہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے میں ہی صرف کرتا تھا۔

زمانے کا چکر چلتا رہا۔ چرخِ کہن کے سائبان تلے کئی انقلابات آئے، آتے رہے، آتے رہیں گے۔ وقت کا دھارا بہتا رہا، آگے ہی آگے کو۔ اُس نے کبھی پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا اور نہ اُسے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت ہی ہے۔ دنیا کی ہر چیز پرانی ہو جاتی ہے، بوڑھی ہو جاتی ہے۔ صرف ایک وقت ہی ہے جو کبھی بوڑھا نہیں ہو جاتا۔ وقت کا کاتب فیصلے لکھتا رہا، فیصلے دیتا رہا، فیصلے سُناتا رہا اور اس طرح سے اور بیس سال بیت گئے۔

دل کا دورہ پڑنے کے باعث اُسے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

کارڈیالوجی وارڈ کے انتہائی نگہداشت والے حصے میں رات کے وقت اُسے ہوش آیا۔ وارڈ میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مریضوں کی سانس کی آوازیں یا کسی کسی مشین کی ہلکی سرسراہٹ پُراسرار سرگوشیاں لگ رہی تھیں۔ جب اُس کے حواس کسی حد تک بحال ہوئے وہ بیڈ پر بیٹھ کر دائیں بائیں نظریں دوڑانے لگا۔ اُس سے کچھ فاصلے پر ایک مریض اُس کی دائیں جانب تھا جس کو کئی آلات اور پائپ لگے تھے۔ اُس کی بائیں طرف ایک عورت تھی جو اُسی کی جانب منہ کر کے کروٹ سے لیٹی تھی اور اُس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ اُس نے غور سے عورت کی طرف دیکھا اُسے لگا وہ چشمے والی لڑکی ہے مگر جلد ہی اُس کو اپنی نادانی پر ہنسی آئی۔ مگر اگلے ہی پل جب اُس نے عورت کی طرف بھرپور نظروں سے گھورا تو بڑی مشکل سے وہ دوسرے دل کے دورے کو بچا سکا۔ اُس کو لگا بلکہ اب پورا یقین ہوگیا کہ وہ وہی چشمے والی لڑکی تھی جس کی راہ وہ سابقہ پچاس برسوں سے دیکھ رہا تھا اور جسے صرف ایک بار دیکھنے کے بعد دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہی رہی تھی۔ جس کے لیے، جس کے پیار کے لیے اُس نے ساری دنیا سے ہی قطع تعلق کر لیا تھا۔ اُس نے پہلی بار لڑکی کو دیکھتے ہی اپنے من میں اُس کا نام غزالہ دیا تھا۔ وہ اپنے آپ سے کہنے لگا یہ ضرور غزالہ ہے۔ ہوبہو غزالہ بلکہ بالکل وہی۔ میری نظریں دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔ یہی وہی ہے یقیناً وہی ہے۔ وہ دیوارنہ وار اُٹھا اور نزدیکی بیڈ کے پاس جا کر اُس نے لیٹی ہوئی مریضہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''غزالہ'' ____ جلترنگ بج اُٹھے۔ شہنائیاں واری ہوگئیں۔ راگنیاں جھومنے لگیں، محبتیں مسکرانے لگیں اور پھول سجدہ ریز ہوئے۔ مریضہ نے آنکھیں کھولیں۔ وہ چونک پڑی۔ غور سے اُسے دیکھنے لگیں۔

آنسوؤں کی ایک دھار ہر دو جانب بہہ نکلی۔ پچاس سالہ جدائی اور انتظار کے لمحات ایک ایک کر کے اپنا حساب کر کے بہنے لگے۔ بھیگتے رہے ——— "غلام کہاں رہے اتنے سال۔ میری ساری عمر ہی تمہارے انتظار میں بیت گئی۔ میری زندگی کی ہر سانس نے تمہیں آواز دی، کیا میری آواز کبھی تم تک نہ پہنچی"۔

"مجھے غلام نہ کہو۔ میں تیس سال تک لگ بھگ ہر صبح تخمر کے بعد چشمے پر پہنچ جاتا تھا۔ مگر تم کبھی دکھائی نہ دی، آخر تم وہاں آتی کیوں نہیں تھی"۔

"میری قسمت ہی پھوٹی۔ میں تمہیں دیکھنے کو آیا کرتی تھی۔ پانی لینے کے بہانے کبھی دن میں دو بار بھی آتی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ جس دن تم آتے میں اُس دن ناغہ کرتی یا دیر سویرے آتی۔ یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ ہماری قسمت میں شاید لمبی جدائی کے بعد ہی ملنا مقدر تھا۔ میرا نام خیرالنساء نہیں راشدہ ہے اور تمہارا نام کیا ہے۔ کیا قسمت ہے ہماری زندگی میں کبھی بات کرنے کا بھی موقعہ نہیں ملا"۔

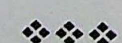
"پہلی نظر تم پر پڑتے ہی میرے دل نے تمہارے لیے یہی نام تجویز کیا تھا۔ میں اسی نام کے ساتھ تمہارے بارے میں سوچا کرتا تھا۔ میرا نام انور ہے۔ میں نے شادی نہیں کی۔ اپنے پرائے سب کو چھوڑ دیا۔ صرف تمہاری یاد کے سہارے آج تک زندہ ہوں۔ کیسی ستم ظریفی ہے یہ"۔

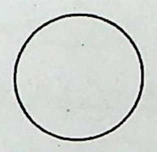
"میری بھی حالت کچھ اچھی نہیں رہی۔ مجھے میرے بھائیوں نے بعد مجبور کیا مگر میں نے ہر بار شادی سے انکار کر دیا۔ میں انکار کی کوئی معقول وجہ بھی نہ بتا سکی جس کے لیے مجھے بہت کچھ سہنا پڑا۔ آخر پر میں نے گھر والوں کی خدمت اور بھائی کے ایک بچے کو گود لے کر اس کی پرورش کا ذمہ لیا اور اس

اس طرح سے مایوس زندگی کے کربناک دن کاٹتی رہی۔تم نے میرے ساتھ کوئی بے وفائی نہیں کی حالانکہ ہمارے درمیان کوئی قول وقرار بھی نہیں تھا۔ یہی میرا فخر اور میرے پیار کی جیت ہے جو پیار ایک انجان نے دوسرے انجان کے ساتھ انجانے میں کیا۔کیسی ستم ظریفی ہے یہ کہ ہمیں ایک دوسرے کا نام تک معلوم نہ تھا اور زندگی میں کبھی ملنے یا بات کرنے کا موقعہ بھی نہیں ملا۔ انور ــــــ میرے انور ــــــ مجھے تمہیں پانے میں کتنی دیر لگی۔ مجھے لگتا ہے جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔صدیاں ہی سہی مگر آخر میں نے تمہیں پا ہی لیا ہے۔ مجھے میرا پیار مل گیا۔ میری برسوں کی ریاضت رنگ لائی۔آج میں کتنی خوش ہوں، بیان نہیں کرسکتی۔زندگی میں پہلی بار اتنی بڑی خوشی نصیب ہوئی ہے۔اب میں سکون کے ساتھ مرسکوں گی۔

نصف شب کے بعد طبی عملہ معائنے کے لیے وارڈ میں داخل ہوا اور دو مریضوں کو ایک ہی بیڈ پر ساتھ ساتھ لیٹے دیکھ کر حیران رہ گیا۔وہ بیڈ کی طرف بڑھے اور غصے میں آکر وہ نہ جانے کیا کرتے مگر انہوں نے دیکھا کہ دونوں مریض ایک دوسرے کے گلے میں اس طرح بانہیں ڈالے تھے کہ اُن کو ایک دوسرے سے جُدا کرنا ممکن نہ تھا۔

دو پیار کرنے والے، دو جسموں اور دو روحوں کا سنگم ہو چکا تھا۔





شہرِ خموشاں

(خلیل جبران)

نہیں یہ مرحلہ اے دوست ہر بسمل کی قسمت میں
بہت مشکل سے کوئی زخمِ دِل ناسور ہوتا ہے

(عامر عثمانی)

شہرِ خموشاں

پرسوں میں شہر کے بھیڑ بھاڑ اور شور و ہنگامے سے نکل کر کھیتوں کی طرف چل دیا۔ میں نے ایک اونچے ٹیلے پر جا کر دم لیا جس پر قدرت نے ایک حسین اور خاموش سی چادر تان دی تھی۔ یہاں پر آ کر میں نے کھل کر لمبی لمبی سانسیں لیں۔ کچھ دیر تک سستانے کے بعد جب میں نے پیچھے کی طرف نظر دوڑائی تو مجھے شہر جس پر دوکانوں کی چمنیوں سے نکلنے والے دھوئیں نے ایک پردہ سال ڈال رکھا تھا اپنی شاندار مسجدوں اور بلند و بالا تعمیرات کے ساتھ بڑا خوبصورت لگا۔

میں نے انسانی زندگی کی تخلیق اور اُس کے مقصد پر غور کرنا شروع کیا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ انسانی زندگی آلام و مصائب اور مشکلات کی آماجگاہ ہے۔ میں نے بالآخر اس مسئلے پر بھی سوچنا چھوڑ دیا کہ اولادِ آدم نے دنیا میں آ کر کیا کچھ کیا ہے۔ میں نے اپنی نظریں کھیتوں پر مرکوز کر دیں جن کو ہم ربِ کائنات کی رزاقی کا تختِ شاہی بھی کہہ سکتے ہیں۔ انہی کھیتوں کے ایک تنہا گوشے میں مجھے قبرستان کی جگہ بھی نظر آئی جو سفیدے کے درختوں سے محصور تھی۔

اُسی شہرِ خموشاں، اُسی مردوں اور زندوں کے درمیان حائل جگہ کو ذہن میں سمائے میں خیالوں کی دنیا میں کھو گیا۔ میرے ذہن میں پہلے دائمی سکوت اور اذاں بعد لاانتہا غم واندوہ کے بارے میں خیالات آتے جاتے رہے۔

شہرِ زنداں میں [illegible] امید و ناامیدی، محبت و نفرت، خوشی اور غم،

تونگری اور بدحالی، وفا اور بے وفائی کی کیفیات پائیں جب کہ شہر خموشاں میں مٹی____ مٹی میں دفن ہے جسے فطرت رات کی تنہائیوں اور خاموشیوں میں نباتات میں اور اُس کے بعد حیوانات میں اور بعد ازاں انسان میں متبدل کر دیتی ہے۔ میں انہی خیالات میں نہ جانے کہاں بھٹک جاتا کہ اچانک میں نے ایک جماعت کو مودبانہ انداز سے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دیکھا۔ اُن لوگوں کے ساتھ کچھ باجا بجانے والے بھی تھے جو اپنی دھنوں سے ماحول کو گھمبیر بنا رہے تھے یقینی طور یہ ایک ماتمی جلوس تھا۔ مردے کے پیچھے پیچھے زندہ لوگ آہ و بکا کرتے اور مردے کی جدائی کا ماتم کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ جلوس جنازہ ایک مخصوص جگہ پر تھوڑی دیر کے لیے رُکا تو پادریوں نے خوشبویات کو جلا کر زور زور سے دعائیں پڑھنا شروع کیں اور بینڈ بجانے والوں نے متوفی کے لیے اور زور شور سے ماتمی دھنوں کا الاپ کیا۔ تب بڑے بزرگ ایک ایک کر کے آگے بڑھے اور انہوں نے چنیدہ اور منتخب الفاظ کے ساتھ متوفی کی مدح سرائی کی۔

بالآخر ساری جماعت، سارے لوگ جو اس جنازے کے ساتھ آئے تھے ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے اور میت کو پتھروں سے بنائے گئے ایک شاندار تہ خانے میں جسے خوبصورت اور قیمتی پھولوں کے گلدستوں اور ہاروں سے سجایا گیا تھا، میں ایک طویل آرام کرنے کے لیے چھوڑ گئے۔

میت کو دفنانے والے اور الوداع کہنے والے شہر میں اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے اور میں دور سے اُن کے پاؤں سے اُٹھنے والی گرد کو دیر تک دیکھتا رہا اور اپنے آپ سے ہی باتیں کرتا رہا۔ سورج ڈوبنے کی

تیاری کر رہا تھا اور کارساز فطرت اُس کے سونے کے لیے کئی تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔ دریں اثنا میں نے دیکھا کہ دو آدمی ایک پُرانے لکڑی کے بوسیدہ صندوق کے بوجھ تلے دبے چلے آرہے ہیں اور ایک میلی کچیلی بدصورت عورت اپنی گود میں ایک بچے کو اٹھائے اُن کے پیچھے پیچھے چلی آرہی تھی اور سب کے آخر میں ایک افسردہ اور مایوس کتا تھا جس نے حسرت بھری نگاہوں سے پہلے عورت کو گھورا اور تب ایک حسرت بھری نظر صندوق پر ڈالی۔

یہ ایک غریب آدمی کا جنازہ تھا۔ موت کے مہمان نے اپنے پیچھے ایک خستہ حال عورت اور اُس کے غموں میں شریک ہونے کے لیے ایک معصوم بچہ اور ایک وفادار کُتا جس کا دل ہی اُس کے مالک کی جدائی کو محسوس کر سکتا تھا ــــــــ کو اس ظالم دنیا میں دھکے کھانے اور دُکھ اٹھانے کے لیے چھوڑ دیئے تھے۔ جب وہ لوگ قبرستان کے قریب پہنچ گئے تو انہوں نے مرصع مقبروں، سنگ مرمر کے کتبوں اور محراب دار مضبوط تہہ نشینوں اور تراشیدہ پھولوں کی کیاریوں اور جھاڑیوں سے ہٹ کر دور ایک گڈھے میں اُس پرانے بوسیدہ صندوق کو ڈالا اور ملتجی نگاہوں سے خدا کے حضور چند الفاظ سے رجوع کر کے جہاں سے آئے تھے اُدھر کو ہی لوٹ گئے۔ جونہی یہ چند نفوس درختوں کے پیچھے نظروں سے اوجھل ہو گئے تو متوفی کا وفادار کتا بھی ایک آخری حسرت بھری نظر اپنے مالک کے مدفن پر ڈال کر اُن کے ساتھ شامل ہو گیا۔

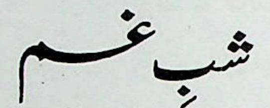
میں نے شہر زنداں کی طرف دیکھ کر اپنے آپ سے کہا:

''وہ جگہ چند نفوس کے لیے ہے'' اور تب میں نے صاف ستھرے شہر

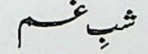
خموشاں کی طرف دیکھ کر اپنے آپ سے کہا ''یہ جگہ بھی چند لوگوں کے لیے وقف ہے۔ اے خدا اللہ مجھے بتا سب لوگوں کے لیے تب وہ مخصوص جنت کہاں پر ہے''۔ جب میں نے ایسا کہا تو میں نے دیکھا کہ آسمان کے ڈولتے بادل سورج کی لمبی، خوبصورت اور سُنہری کرنوں کے ساتھ بغل گیر ہو رہی تھیں تبھی میں نے اپنے اندر کی ایک آواز سنی جو بتا رہی تھی اُدھر ______

وہ ______ وہاں ______





متاعِ دل بھی گئی دل کی آرزو بھی گئی
مجیبؔ کس سے شبِ غم کا ماجرا کہتے
(محبوب اللہ مجیبؔ)



اُن دنوں میں پولیس میں ملازم تھا اور میری ڈیوٹی شہر سے باہر ایک گاؤں میں تھی۔ ایک دن صبح ہی صبح پولیس چوکی میں اطلاع ملی کہ گاؤں کے بڑے چشمے کے پاس بیدوں کے جھنڈ میں ایک نوجوان کی لاش درخت کے ساتھ لٹک رہی ہے اور ظاہراً طور واردات قتل کی نہیں بلکہ خودکشی کی لگ رہی ہے۔ بہرحال معاملہ جو بھی تھا میں ضروری سامان اور پولیس عملے کے ساتھ جائے واردات پر پہنچا۔ ہم نے درخت کے ساتھ لٹکتی ہوئی لاش کو نیچے اُتارا، ضروری کاروائی عمل میں لائی، پنچ نامہ تیار کیا اور لاش کو پوسٹ مارٹم کی خاطر ڈسٹرکٹ ہسپتال کو روانہ کیا۔ یہ ایک چوبیس پچیس برس کے نوجوان کی لاش تھی جس کی طرف دیکھ کر ہی افسوس ہوتا تھا۔ ضابطے کی کاروائی کے دوران جامہ تلاشی میں مرحوم نوجوان کی جیب سے ایک تحریر ملی جو کچھ اس طرح سے تھی۔

''رات لوگوں کے لیے آرام و آسائش بلکہ راحت و سکون فراہم کرتی ہے۔ ساری کائنات شادمانی اور طمانیت کی سانس لیتی ہے۔ مگر یہی رات بے آرامی اور بے اطمینانی کے مہیب سائے میرے وجود پر طاری کر دیتی ہے۔ رات میرے زخموں پر نمک پاشی کر کے مجھے بے چین و بے قرار کر دیتی ہے۔ رات میرا سکون بُرباد کر کے مجھے مجروح کر دیتی ہے اور دل پر کچوکے لگاتی ہے۔ میرے لیے رات ـــــــ ناسوروں کا رِسنا اور زخموں کی کسک ہے۔ آہوں، کراہوں اور چیخوں کی علامت ہے۔ میرے لیے رات مسمار رنگین خواب اور دم توڑتی ہوئی آرزوئیں ہیں۔

وہ بھی ایک ایسی ہی رات تھی ـــــــ ہولناک ـــــــ اور ارمانوں پر

آری چلانے والی، خاک میں ملانے والی، میں اپنے چھوٹے سے گھر کے دروازے سے لگ کر یاس وحسرت اور پھٹی پھٹی متوحش نگاہوں سے اُس ڈولی کو تک رہا تھا جس کو کہار کندھوں پر اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ ڈولی کے اندر راشدہ تھی ــــــ اور اپنے گھر اپنے گاؤں سے نکل کر کہیں دور ــــــ دوسرے گھر ــــــ دوسرے گاؤں میں جا رہی تھی۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ آیا وہ راشدہ کی ڈولی تھی یا میرے ارمانوں، میری خوشیوں اور میری چاہتوں کا جنازہ۔ میری دُنیا لٹ رہی تھی اور میں بے یار و مددگار بس ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ ایک انسان اتنا بھی بے بس ہو سکتا ہے اُس کا احساس مجھے اُس دن سے قبل اتنی شدت سے کبھی نہیں ہوا تھا۔

میں ایک فرد واحد ہوں ــــــ

اکیلا ــــــ آگے پیچھے کوئی نہیں۔ میرے والدین سیلاب کی زد میں آ کر جاں بحق ہو گئے اور میری تعلیم ادھوری رہ گئی۔ آسودہ حالی ہوتی تو سب اپنے بن جاتے، بن بلائے چلے آتے۔ یہی وجہ ہے کہ میری ناداری کی وجہ سے میری دنیا محدود ہو کے رہ گئی۔ کام سے لوٹتا تو اپنے چھوٹے سے گھر میں بیٹھ کر اپنی خیالی حسین دنیا کے تانے بانے بُنتا رہا۔ مگر اس دوران اس بے مقصد اور نامراد زندگی کے تاریک آسمان پر ایک تارا چمکا، ایک چاند طلوع ہوا جس کی جِلا سے میری اندھیری دُنیا میں نور کی بارش ہو گئی۔ مجھے لگا کہ میری بھی کوئی ہستی ہے، میرا بھی کوئی وجود کوئی اہمیت ہے۔ راشدہ میری زندگی میں چپکے سے داخل ہو گئی اور میری زندگی میں بہار آ گئی۔ راشدہ نے مجھے پیار دیا اور دل و جان سے چاہا اور میں نے بھی اُس کے پیار کی قدر کی اپنے دل کی عمیق گہرائیوں کے ساتھ اُس کا پیار میرا سہارا ثابت ہوا۔ اُسی سہارے نے مجھے

دنیا میں زندہ انسانوں کی طرح زندہ رہنا سکھایا۔ میں اُس کے پیار میں اس قدر کھو گیا کہ مجھے اپنی کم مائیگی اور کسی کمی کا احساس ہی نہ رہا۔ میں ہنسنے لگا۔ میرے وجود پر طاری اندھیارے چھٹ گئے اور پیار کی قندیلیں روشن ہو گئیں۔

میری یہ تبدیلی گاؤں والوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ مگر اس تبدیلی کا باعث کیا تھا وہ یہ نہیں جانتے تھے۔ محبت کا دوسرا نام ہی انقلاب ہے۔ محبت ازل سے تھی اور جب تک یہ دنیا قائم ہے۔ محبت کے بیل بوٹے کھلتے رہیں گے۔ محبت ماضی کی وہ ڈالی ہے جس کی کلیاں حال میں چٹکتی ہیں اور مستقبل میں خوشبو دیتی ہیں۔ محبت وہ سدا بہار پیڑ ہے جس پر خزاں کے گھیرو ے سائے کبھی نہیں منڈلاتے۔

راشدہؔ اور میں ہر روز شام ڈھلے بڑے چشمے کے پچھواڑے بیدوں کے جھنڈ میں ملا کرتے تھے۔ ہم وہاں پر بیٹھ کر باتیں کرتے ____ اپنی باتیں ____ اپنے مستقبل کی باتیں ____ شادی اور بچوں کی باتیں اور بعض اوقات بے مقصد اور فضول باتیں ____ اور اس طرح سے جب شام کے سائے گہرے ہو جاتے تو ہم بد دلی کے ساتھ وداع ہو جاتے۔

مگر افسوس وقت نے میرا ساتھ نہ دیا۔ میری قسمت کے دھند لکے ایک بار پھر یکجا ہوئے۔ ہوا کچھ بھی نہیں مگر بہت کچھ ہوا۔ دل ٹوٹا پر آواز نہیں آئی ____ جسم کا ایک حصہ کٹ گیا مگر خون کا ایک قطرہ نہ بہا۔ ایک رات گاؤں میں شہنائی کی آواز گونجی۔ گھوڑی پر بیٹھ کر کہیں سے دولہا آیا اور راشدہؔ کو ڈولی میں بٹھا کر لے گیا۔ مجھ سے دور ____ گاؤں سے دور ____ اور ہی کسی دِشا میں۔ میں اُس بارات کو، اُس ڈولی کو ٹکر ٹکر دیکھتا

رہا۔ میں نے چیخنا چاہا مگر میرا دم گھٹ کے رہ گیا۔ میرے لگاتار تھل تھل بہتے آنسو اپنے ساتھ تمام حسین و رنگین خوابوں کی دنیا کو بہا کر لے گئے۔ ڈولی جونہی میرے گھر کے سامنے سے گذرنے لگی تو راشدہؔ نے ڈولی کا پردہ ایک طرف سرکا کر رواں دواں آنسوؤں کی جھڑی کو دونوں ہتھیلیوں سے پونچھ کر کچھ کہا جو شور ہونے کے باعث سنائی نہیں دیا، میں نے فقط اُس کے ہونٹ ہلتے دیکھے۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی گرم گرم دو دھارائیں بہہ نکلی جن سے آنکھوں کے سامنے ایک پردہ سا حائل ہو گیا اور جب میں نے اپنی آستین سے آنسو پونچھ کر دیکھا تو بارات آگے نکل کر بیدوں کے جھنڈ کے پیچھے روپوش ہو چکی تھی۔

راشدہ کی شادی کے تقریباً چھ ماہ بعد میں نے ایک دن چشمے کی طرف سے کچھ لوگوں کو چارپائی پر کسی کو اٹھا کر گاؤں کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ یہ لوگ جب میرے گھر کو قریب پہنچے تو چارپائی پر لیٹے جسم میں حرکت ہوئی۔ اُس نے منہ پر پڑا اپلوسر کایا______ وہ راشدہ تھی۔ زرد مدقوق چہرہ______ دھنسی ہوئی بے نور آنکھیں______ ہڈیوں کا پنجر______ اللہ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ اُس کے چہرے کی شادابی فقط چھ مہینوں میں ہی رخصت ہو چکی تھی۔ اُس نے اپنی بے نور آنکھوں سے میری طرف ایک بھرپور نظر ڈالی اور اُس کے ہونٹوں میں حرکت ہوئی یا مجھے ہی ایسا گمان ہوا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہی ہے______ ''سلطان دیکھو میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ میں لوٹ کر تمہارے پاس آ گئی______ اب ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا''۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں روؤں یا خوش ہو جاؤں۔ اِسی ادھیڑ بُن میں تھا اور مشکل سے پندرہ بیس منٹ گذر گئے ہوں گے کہ راشدہؔ کے گھر سے

رونے پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ اُدھر کو دوڑ پڑے۔ گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ راشدہ نے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں تھیں۔

میرا انتظار بھی ختم ہو گیا۔ اب دیر کرنا فضول ہے۔ مجھے راشدہ کی تلاش میں نکل جانا چاہیے۔ میں خودکشی کر رہا ہوں۔ میرے موت کی ذمہ داری کسی اور کے سر نہ ڈالی جائے"۔

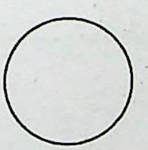
میرے دل سے ایک ہوک سی اُٹھی۔ میں نے وہ کاغذ جو مردہ وجود کی زندہ محبت کی داستان بیان کرر ہے تھے تہہ کر کے جیب میں رکھ لئے اور دوسرے کاموں کی جانب متوجہ ہوا۔

بیدوں کے جھنڈ سے کافی دور ______

کوئی اپنی ہی مستی میں ______ بڑی لاپرواہی مگر میٹھی اور سریلی آواز میں گائے جا رہا تھا ______

ع وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گذار کے





رات باقی ہے

رات باقی تھی جب وہ بچھڑے تھے
کٹ گئی عمر رات باقی ہے
(خمار بارہ بنکوی)

رات باقی ہے

گھر باہر ــــــ کہیں بھی ــــــ راستے میں ــــــ دوستوں کی محفل ہو یا احباب کی بیٹھک ــــــ رمتے جوگی کی الکھ ہو یا یاتریوں کی پُکار ــــــ ریل میں ــــــ بس میں ــــــ دوران سفر جس جگہ بھی باتوں کے دوران یا یونہی اتفاقیہ ''جے ماتا دی'' کے الفاظ تذکرے میں آتے یا سنائی دیتے تو عابد صاحب یہ الفاظ سنتے ہی کچھ بے قرار سے ہو جاتے تھے جو بات حاضرین محسوس کئے بنا نہیں رہتے۔ اُن کے احباب نے اس کا سبب یا وجہ پوچھی تھی مگر انہوں نے اُن پر کسی ردِ عمل ہونے سے ہی انکار کر دیا تھا۔

عابدؔ صاحب اپنے حلقے ــــــ اپنے علاقے کے معروف، باوقار اور ایک عزت دار شخص تھے، بے حد ملنسار، خلیق اور نرم دل۔ بڑھاپے میں بھی وجیہہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بے حد میٹھی زبان بولتے تھے اور خوبصورت الفاظ کا استعمال کرتے اس لیے اُن کے ساتھ بات کرنے میں ایک لطف آتا تھا۔

عابدؔ صاحب کو ریٹائیر ہوئے آٹھ سال ہو چکے تھے۔ وہ اپنی ملازمت کے دوران بے حد مشکل مراحل سے گذرے تھے لیکن اُن کی شرافت اور ایمانداری میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ رشوت اور ناجائز مراعات کے خلاف رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ماتحت بلکہ بڑے افسر بھی اُن سے ناخوش رہتے تھے مگر اُس کے باوجود ہر چھوٹا بڑا ملازم اُن کا بے حد احترام کرتا تھا۔

عابدؔ صاحب کے تین بچے تھے ــــــ ایک لڑکی اور دو لڑکے۔ تینوں نہ صرف سیٹل (Settle) ہو چکے تھے بلکہ سبھوں کی شادیاں بھی ہو چکی

تھیں اور اُن کے بھی بچے تھے۔ عابد صاحب کا بڑا بیٹا بزنس مین تھا اور اپنے باپ کی طرح اپنے حلقے میں کافی مقبول تھا۔ دوسرا صاحبزادہ ڈاکٹر فرحت سرکاری ملازمت میں تھا اور ایک اچھا شاعر ہونے کے ناطے ادبی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔

ایک دن کھانے کے دوران پتہ نہیں کیا موضوع لے کر ''کیسے جے ما تا دی'' کے الفاظ دوران گفتگو نکل آئے۔ عابد صاحب نے گرچہ محسوس نہیں ہونے دیا مگر وہ بے حد مضطرب ہو کر مزید کوئی گفتگو کئے بنا ہی دستر خوان سے اٹھ کر چلے گئے۔ اگلے دن ڈاکٹر فرحت نے اُن سے اس طرح اٹھ کر چلے جانے کی وجہ پوچھی بلکہ یہ بھی پوچھا کہ کیا کسی سے کوئی گستاخی سرزد ہوئی تھی۔ مگر عابد نے مسکرا کر کوئی وجہ بتائے بغیر ہی بات کو ٹال دیا بلکہ ناراضگی سے تو قطعی انکار کر دیا۔

پھر اس واقعہ کے دس برس بعد عابد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ایک دن کسی کاغذ کی تلاش کے دوران عابد صاحب کے صاحبزادے ڈاکٹر فرحت کو پُرانے کاغذات میں عابد صاحب کی ایک پرانی فائیل سے دو خط ملے جو پھٹے ہوئے تھے اور لگتا تھا کہ تلف ہونے یا تلف کرنے سے رہ گئے ہیں۔ دونوں خط ہندی میں تھے جو کچھ اس طرح سے تھے۔

پہلا خط:

میں سمجھتی ہوں کہ یہ پتر و ویہار، اب بند ہو جانا چاہیے۔ اگر میرا یا آپ کا پتر اِدھر اُدھر ہو گیا تو بہت بدنامی ہوگی۔ یہ میری کتنی بڑی بھول ہے کہ میں جان بوجھ کر مور کھ بن رہی ہوں۔ ہمارا ملن کسی صورت میں ہو ہی نہیں سکتا مگر پھر بھی ہم پیار کی راہوں میں آگے ہی آگے کو بڑھ رہے ہیں۔ آپ نے سچ

میں ہی مجھ پر جادو کر دیا ہے۔

یہ کیسا پیار ہے؟ میں آپ کے پیچھے دیوانی ہو رہی ہوں۔ میں چھوٹی یا ناسمجھ تو نہیں ہوں مگر یہ ستیہ ہے کہ میں ایک کنواری لڑکی ہوں اور اس ناطے اگر ہمارے سمبندھ کے بارے میں کسی کو پتہ چل گیا تو کیا ہوگا اور جو ہوگا اُس کا انومان تو آپ بھی لگا سکتے ہیں۔ مجھے اپنا فکر نہیں آپ کی چنتا ہے۔

یہ ستیہ ہے کہ آپ نے مجھ سے پیار کے علاوہ کبھی کچھ نہ چاہا اور نہ میں نے آپ کی آنکھوں میں لوبھ یا چھل کی کوئی پرچھائی دیکھی۔ آپ نے میرے پیار کا اقرار کیوں کیا۔ بتایئے؟ کیا آپ کو مجھ سے ہمدردی تھی۔ میری ڈھلتی آیو کے کارن آپ مجھ پر ترس کھاتے تھے۔ آخر یہ کون سا جذبہ؟ کیسا پیار ہے۔ میرا من بالکل میرا ساتھ نہیں دے رہا ہے بلکہ میرے سوچنے سمجھنے کی طاقت ہی دم توڑ چکی ہے۔ میں کیا کروں؟

آپ بیوی بچوں اور گھر بار والے تھے۔ کیا آپ نے میر ساتھ سمبندھ بڑھاتے وقت اس پر دھیان نہیں دیا۔ پرنتو میں آپ کو ہی کیوں دُوشی مانوں، میں نے تو بھی جان بوجھ کر مؤرکھتا کر ڈالی۔ خیر چھوڑیئے جانے دیجئے اِن باتوں کو۔ جب اوکھلی میں سر دیا ہے تو پھر دھماکوں سے کیا خوف۔ آپ میرے ہیں یہی بہت ہے۔ سنسار میں مجھے اگر وِرہ ہی سنجوگ تھا، تڑپنا ہی بھا گیہ تھا، وہی سہی، مگر یہ کیا کم ہے کہ مجھے ایک چاہنے والا، ایک پریم کرنے والا ملا۔ خط کو پڑھتے ہی جلا ڈالنا۔ اچھا رکھتی ہوں، بہت پیار کے ساتھ جے ماتا دی۔

دوسرا خط:

آج میں بہت اُداسی ہوں۔ میں نے وہ ساری باتیں سُن لی ہیں جو ڈاکٹر صاحب ماتا جی کو بتا رہے تھے۔ اس بیچ آنکھیں صرف آپ کو دیکھنے کے لے

ترس رہی تھیں۔ میری باتوں میں کوئی لاگ لپٹ نہیں ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ میں نے آج تک آپ کو ٹوٹ کر چاہا ہے بلکہ آج بھی آپ پر نچھاور ہونے کو تیار ہوں۔ سنسار میں بس آپ ہی میرے پریہ پریتم ہیں۔

پرنتو کیا کروں میں شاید اِدھک دیر تک جبوت نہ رہ پاؤں۔ میری آتما بھی اب آپ میں ہی وِلین ہونا چاہتی ہے۔ میں ٹوٹ چکی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں ایک بجھتے ہوئے دیے کی ٹمٹماتی لو ہوں جس کو ایک ہلکا سا پون کا جھونکا بھی اندھیری دِشاؤں میں گُم کر سکتا ہے۔ اب کوئی حسرت کوئی اِچھا نہیں۔ میں کیول آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ اگر سنبھو نہ بھی ہو تو بھی درشن دینے کی کوئی راہ نکالنا۔ میں اپنے جیون کی باقی سانسیں آپ کی یاد میں پوری کروں گی۔ آپ کا پریم میرے انتم سمے تک میرے ہردئی میں امر رہے گا۔ اگر دنیاوی اور سماجی بندھنوں اور سنسکاروں کے کارن ہم ایک دوسرے کے نہ ہو سکے وہ سنجوگ کی بات ہے مگر وہ آپ کا پریم میرے دل سے چھین تو نہیں سکتے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ بہت بے چین ہوں۔ پرماتما کرے آپ سدا پرسن رہیں۔

__________ جے ماتا دی

دوسرے خط کے حاشیے پر عابد صاحب کے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک نوٹ یوں تھا:

یہ خط لکھنے کے بعد ٹھیک ساتویں دن اُس کا انتقال ہوا۔ خدایا! تو نے محبت کیوں پیدا کی ہے۔ کاش ہم ملے نہ ہوتے تو یادوں کا زنداں اتنا اذیت رساں اور کربناک نہیں ہوتا۔

رات باقی تھی جب وہ بچھڑے تھے

کٹ گئی عمر رات باقی ہے

سرراہ چلتے چلتے

آرزوئیں کروٹیں بدلتی ہیں
آ بھی جاؤ کہ رات ڈھلتی ہے

(سکندر حیات)

سرراہ چلتے چلتے

سن ۱۹۴۷ء پارٹیشن یعنی تقسیم ملک کے وقت سارے برصغیر میں کیا ہوا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ انسان درندے سے بھی بدترین بن گیا تھا اور بنت حوا کی عزت ٹھیکری کے برابر بھی نہ رہ گئی تھی۔ جنم دینے والی ہستی کی وہ گت بن گئی تھی کہ فضائیں تھرا اُٹھیں اور ہوائیں چیخ و پکار کرنے لگیں۔ بارہ لاکھ انسانوں کا بے رحمانہ قتل اس صورت میں ہوا کہ انسانیت شرمندہ ہو کے رہ گئی۔ وقت گرچہ انسانی درد و مصائب کا بہترین علاج ہے مگر تاریخ کے اوراق اُس روح فرسا سانحہ پر صدیوں تک اشکبار رہیں گے۔ آگ سارے ہندوستان میں لگی مگر بلاشبہ وہ یک طرفہ تھی مگر پنجاب میں خاص طور سے ہر دو جانب زیادتیاں ہوئیں۔ اس طرف کے لوگوں نے لاشوں سے بھری ٹرین کو اُس طرف روانہ کر کے ہری جھنڈی دکھائی۔ اور اُس طرف کے لوگوں نے ویسا ہی تحفہ واپس روانہ کر کے اشرف المخلوقات ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔

فروری سن ۲۰۰۶ء میں آنکھ کی جراحی کے سلسلہ میں مجھے امرتسر جانا پڑا۔ آپریشن سے قبل میں نے گولڈن ٹیمپل کے علاوہ کئی اور جگہیں بھی دیکھیں۔ اور واپسی پر میں یونہی گھوم گھام رہا تھا اور متواتر سن سینتالیس کے دردناک اور خونین واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ جیسے جید علماء اور مفسرین قرآن کے اس مادر وطن میں اُن دنوں کیسا ننگا ناچ ہوا ہوگا کہ اچانک حال بازار میں مجھے ایک گورے رنگ کی خوبصورت بزرگ خاتون نے راستہ روک کر اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''بچے کیا تُسی مسلمان ہو''؟

''آہو! اماں پر تُسی یہ کیوں پچھدی ہو''۔

میں نے سر کو اثبات میں جنبش دے کر پنجابی زبان میں ہی جواب دینے کی کوشش کی۔

بزرگ خاتون صرف مسکراتی رہی، اُس نے میرے سوال کو نظر انداز کر دیا۔ البتہ بڑی دلچسپی کے ساتھ مجھے نہارتی رہی اور میرے سراپا کا بغور جائزہ لیتی رہی۔ اُس کے بعد اچانک اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک دھارا بہہ نکلی جو میرے خیال سے اپنے ساتھ نہ جانے کتنے اذیت رساں واقعات اور کربناک لمحات کے درد کو بہا کر لے گئی۔ مجھے دیکھ کر اُس کی کتنی بھولی بسری یادیں از سر نو تازہ ہوئی ہوں گی، اُس کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے آگے کی طرف بڑھنے لگی اور میں حیران و متذبذب ہونقوں کی طرح جھکی کمر کے اُس سراپا کو دیکھتا رہا_____ دیکھا رہا_____ حتیٰ کہ وہ موڑ مڑ کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میں بھی اماں کے پیچھے اُسی راستے پر ہولیا، پر اماں کہیں دکھائی نہیں دی۔



سزا

تم ہی بتاؤ اہلِ چمن کا وہ چمن ہی کیا
جس میں نہ عندلیب کوئی نغمہ خواں رہے
(جمال احمد)

سزا

اکبر صاحب لوگوں کو اپنی تلخ، تُرش، شیریں، یادوں کے اُڑن کھٹولے پر بٹھا کر دنیا کی سیر نہیں کرانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کے ماضی کی داستانوں کے ساتھ کوئی جڑنا پسند نہیں کرے گا۔ کوئی ایک آدھ واقعہ بھی سننے کے موڑ میں نہیں ہوگا بلکہ وہ اپنے حال کی سرگذشت، اُس کے ساتھ پیش آرہے معاملات کے بارے میں لوگوں کو آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ اپنی تکالیف اور دُکھوں کا مداوا چاہتا تھا۔ مگر کسی کو کیا پڑی تھی جو وہ اُس کی پتا سُنتا۔

جوانی میں ضرورت نہ بھی ہو تب بھی آدمی پیسہ یونہی برباد کرتا ہے، مستی میں اڑاتا ہے، اپنے شوق پورے کرتا ہے، یار دوستوں کے ساتھ فضول خرچیاں کرتا ہے مگر اکبر صاحب نے کبھی ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ جونہی اُسے اپنا کوئی شوق پورا کرنے کا خیال آتا اُدھر سے ضرورت کی تلوار میان سے باہر آجاتی۔ شادی سے قبل والدین کی دیکھ ریکھ اور دوادارا اور شادی کے بعد اپنے عیال کی ضروریات۔ کبھی ایک بیٹے کو کتابیں چاہیں، کبھی دوسرے کو نئی وردی بنانے کی ضرورت پڑتی، کبھی تیسرے بیٹے کا ایکس کرشن نیزے کی انّی کی طرح خوفزدہ کرتا اور کبھی چوتھے بیٹے کی جوتے کی فکر لاحق ہوجاتی۔ میاں بیوی تو لگ بھگ اپنے آپ کو بھول ہی چکے تھے، گرچہ اُن کی بھی اپنی ضروریات تھیں جو وہ بڑی مشکل سے پوری کر پاتے تھے۔ اس طرح سے اکبر صاحب نے جوں توں کر کے چاروں بیٹوں کو پروان چڑھایا۔ اُن کی دیکھ ریکھ اور تعلیم کے ساتھ ساتھ اُن کی ہر ضرورت پوری کی جس کے لیے اُس نے ہمیشہ اپنی خواہشات کو قربان کر دیا۔

یوں اُس کے چاروں بیٹے بڑے ہوئے، جوان ہوئے، پڑھ لکھ کر روزی روٹی سے لگ گئے۔ سب کی شادیاں ہوئی اور اکبر صاحب وہی گھاٹ کا پتھر ہی رہا۔ دریا کی موجیں آآ کر اُسے کھدیڑتی رہیں، تھپیڑوں پر تھپیڑے مارتی رہیں اور تیزی کے ساتھ پلٹ کر اُس کو سرد و گرم سہنے کے لیے تنہا چھوڑ کر جاتی رہی۔ وہ بے آب و گیاہ صحرا جیسا جوانی میں تھا۔ ویسا ہی بڑھاپے میں آکر بھی رہا۔ اُس نے کبھی زندگی کا خوبصورت انداز نہیں دیکھا، اُس نے کبھی زندگی کی حسین صبحیں اور رنگین شامیں نہیں دیکھیں۔ اُس نے کبھی بہاروں کی مست مدھر ہواؤں میں کیف و مستی کی سانسیں نہیں لیں۔ اُس کی ساری زندگی بے کیف و بے رنگ ہی گذری۔ گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر انہی دو پاٹوں کے بیچ میں اور گھریلو ضروریات کو پورا کرنے میں اُس کی ساری زندگی گذر گئی، اور ریٹائرمنٹ کے بعد تو معمول کی زندگی کا بھی دھارا بدل گیا۔ وہ گھر میں رہ کر بھی گھر کا فرد نہیں لگتا تھا۔ گھر میں گویا اُس کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ وہ گھر سے باہر جاتا تو واپس لوٹنے کے لیے کوئی اُس کا انتظار نہیں کرتا۔ وہ اگر آتا بھی نہیں تب بھی کسی کو اُس کے آنے کا فکر نہیں لگا رہتا۔ چاروں بیٹے اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ اس قدر مست و مگن تھے کہ اُس کا وجود نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ بیوی کو مرے سات برس ہو گئے تھے مگر اُس کے نہ ہونے کے باوجود اُس کی ضروریات کا کوئی خیال نہیں کرتا۔ جو کچھ کرنا ہوتا خود ہی کرتا۔ دوا دارو کی فکر یا اس طرح کی کوئی انسانی ضرورت اُسے خود ہی انتظام کرنا پڑتا۔ پنشن کا قانون بنانے والے یا اُس شخص کو جس کے دماغ میں سب سے پہلے اس طرح کا خیال پیدا ہوا تھا، کو دعائیں دیا کرتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ اگر آج اُس کو پنشن کے پیسے نہ ملتے ہوتے تو لازماً اُسے بھیک کے لیے

ہاتھ پھیلنا پڑتا۔ اِسی شب و روز کی چکی میں وہ پستا رہا مگر بہر حال عزت نفس بھی اپنی اہمیت رکھتی ہے۔ مشاہدہ ہے کہ اگر ایک دیوانے کو بھی تنگ کیا جائے اور وہ انتقامی کاروائی کرنے کا متحمل نہ ہو تو وہ اپنا ہی گریبان پھاڑ ڈالتا ہے۔

ایک دن اکبرؔ صاحب کے دماغ میں ایک انوکھا خیال ایک کوندے کی طرح لپکا۔ تھوڑی دیر تک اُس عجیب و غریب پلان پر غور کرتا رہا پھر ایکدم اُٹھ کر اپنے واحد رازدار دوست افضلؔ صاحب کے پاس چلا گیا۔ اُس کے ساتھ کافی لمبی چوڑی بحث کے بعد اُس نے آخر اکبر صاحب کے پلان کو منظور کیا اور ساتھ میں ہی رازداری کا بھی وعدہ کیا۔ اور ______ اور پھر ایک دن اکبر صاحب اچانک غائب ہو گیا۔ جب وہ دن بھر نہیں لوٹا تو اُس کی بہوؤں اور بیٹوں نے طوعاً و کرہاً رات کو سونے کے وقت تک اُس کا انتظار کیا اور جب وہ نہیں لوٹا تو من ہی من میں سب خوش ہوئے۔ چلو ''خس کم جہاں پاک'' ہو گیا۔ اگلے دن سے وہ اپنے کام دھندوں اور معمول کی زندگی میں مشغول ہو گئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ کسی نے اُس کو نہ تلاش کیا، نہ رشتہ داروں سے پوچھ تاچھ کی اور نہ ہی تھانے میں رپورٹ لکھوائی۔

اکبرؔ صاحب کے گم ہو جانے کے لگ بھگ بیس روز کے بعد اُن چاروں بیٹوں کو شہر کے ایک نامور وکیل کی جانب سے ایک نوٹس ملا جس میں تنبیہ تھی کہ وہ اُن کے موکل جناب ارجمندؔ بیگ صاحب جو پولیس میں ایک اعلیٰ عہدہ دار ہیں، کے مکان پر ناجائز قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔ اگر مکان کو آنے والے تیس دن کے اندر اندر خالی نہ کیا گیا تو عدالت سے حکم بیدخلی لا کر اُن کے تمام گھریلو سامان کو سڑک پر پھینک دیا جائے گا اور کسی امتناعی یا احتجاجی صورت میں وہ لوگ گرفتار بھی ہو سکتے ہیں۔

اونٹ پہاڑ کے نیچے آگیا۔ اب چاروں بیٹوں کو باپ کی اہمیت اور طاقت کا احساس ہو گیا اور سبھی یہ بخوبی سمجھ گئے کہ باپ نے اُن کی بے توجہی اور بے عزتی کا بدلہ لیا ہے۔ اُن کو اپنی غلطی اور خودغرضی کا احساس تو ہو گیا مگر اُس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس واقعے کے کوئی ایک مہینے کے بعد بڑے بیٹے کو اپنے دفتر کے پتے پر باپ کی طرف سے ایک خط ملا جو اس طرح سے تھا:

میں نے اپنی ذاتی ملکیت بیچ کر وہ رقم ایک یتیم ٹرسٹ کو عطیہ میں دی ہے اور اپنے لیے بود و باش کا انتظام اُسی ٹرسٹ سے وابستہ یتیم خانے میں کیا ہے۔ میں یتیم خانے کا کوئی چھوٹا موٹا کام بھی کیا کروں گا۔ گرچہ ٹرسٹ میری دیکھ بھال کرے گا مگر میں اُن پر بوجھ نہیں بنوں گا کیونکہ مجھے پنشن بھی تو ملتی رہے گی۔ میں انشاء اللہ بڑے آرام و آسائش کے ساتھ زندگی کے باقی دن پورے کروں گا۔ میں نے بھی اپنی جوانی کے دنوں میں کچھ سُنہری سپنے دیکھے تھے مگر میرے وہ سپنے تم بھائیوں کی دیکھ ریکھ اور تعلیم و تربیت کی نذر ہو کر کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ اپنے فرائض کی تکمیل کر کے بڑھاپے میں میری بھی توقعات اپنے بیٹوں کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں مگر تم لوگوں کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ تمہارا بھی ایک باپ ہے اور اُس کی بھی کچھ ضروریات ہیں۔ اگر میری قربانیوں، تمہارے پالن پوشن اور تعلیم و تربیت کو میرا فرضِ عین یا دینی اور اخلاقی سماجی ذمہ داری ہی سمجھ لیا جائے تب بھی میرا تم لوگوں کے ساتھ ایک واسطہ تھا، ایک ناطہ تھا، ایک خونی رشتہ تھا۔ کیا فرض اور ذمہ داریوں کی تلوار صرف باپ پر ہی چلتی ہے۔ بیٹے کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی، کیا میری پرورش و پرداخت میں کوئی کمی رہ گئی تھی جو تم لوگوں نے مجھے بے یار و مددگار چھوڑ کر

میری بے عزتی کی۔ کیا تم لوگوں نے کبھی یہ سوچا کہ تمہارا بوڑھا باپ کبھی کسی درد تکلیف میں بھی مبتلا ہوا ہوگا۔ اُسے نہ صرف دوا دارو بلکہ ہمدردی اپنائیت اور پیار کی بھی ضرورت ہے۔ کسی حاجت، سہولت یا خدمت کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ میں نے اپنی اس بے یار و مددگار زندگی میں مہیب سناٹوں اور کربناک تنہائیوں میں کتنی سسکیوں کا گلا گھونٹا ہوگا، کتنی آہوں کو چھپایا ہوگا اور کتنے آنسو پیئے اور بہائے ہوں گے، وہ تم کیا جانو۔

چونکہ اسلامی قانون کے تحت ایک فوت شدہ شخص کی وراثت اُس کے مرنے کے بعد ہی تقسیم ہوتی ہے اور میں ابھی زندہ ہوں اس لیے میری جائیداد ابھی تم لوگوں میں تقسیم نہیں ہو سکتی تھی، اُس پر ابھی میرے ہی مالکانہ حقوق تھے۔ گویا میں نے تم لوگوں پر کوئی ظلم بھی نہیں کیا جب کہ تم نے مجھے رُسوا کرنے میں کوئی کمی نہیں رکھی۔ اس لیے میں نے سوچا کہ جیسا انوکھا سلوک تم لوگوں نے میرے ساتھ روا رکھا، ویسی ہی انوکھی سزا بھی تم لوگوں کو ملنی چاہیے۔ ایسا میں نے صرف اور صرف مجبور ہو کر کیا۔ کہو کیسی رہی میری سزا؟______

تمہارا بدنصیب باپ
اکبر



شہزادہ بسمل کی تصانیف

- رقصِ بسمل (افسانوی مجموعہ)
(پہلا ایڈیشن:۱۹۸۵ء؛نظر ثانی واضافہ شدہ ایڈیشن:2018ء)
- آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (قدیم ہندو صحائف میں)
(پہلا ایڈیشن:2002ء)
- خدا کے لیے مجھے بچاؤ (جھیل ڈل کی کہانی اُسی کی زبانی)
(پہلا ایڈیشن:2002ء)
- خوشبو کی موت (زیر نظر افسانوی مجموعہ)
- ایک ناول (غیر مطبوعہ)
- ایک ناولٹ (غیر مطبوعہ)
- چھ طویل کہانیاں (غیر مطبوعہ)
- گلدستہ اشعار (بیت بازی کے لیے منفرد انداز میں) (غیر مطبوعہ)
- منتخب کالم (جو چھ جلدوں پر محیط ہوں گے) (غیر مطبوعہ)

وغیرہ

یادداشت

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

hboo ki Mout

زیر نظر افسانوی مجموعہ "خوشبو کی موت" [illegible] دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ ہر افسانے کے آغاز میں ایک خوبصورت [illegible] افسانے کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔........ جناب شہزادہ بسملؔ کا ہر افسانہ [illegible] سمندر ہے جو ہر سطر کے ساتھ پرت پرت کھلتا جاتا ہے اور اس کے اندر پوشیدہ لعل و گوہر کی چمک قاری کے ذہن و دل کی نظر کو خیرہ کرنے لگتی ہے۔ جناب شہزادہ بسملؔ اپنے افسانوں میں واقعات کی جس فنی مہارت اور پُر اثر انداز میں منظر کشی کرتے ہیں اُس کا اندازہ افسانے پڑھنے کے بعد ہوتا ہے۔ جملوں کی ساخت اور استعاروں کا استعمال مصنف کو اتنا اچھا آتا ہے کہ افسانوں کا ہر جملہ قاری کے دل کے تاروں کو چھیڑ کر اُس کے جذبات و احساسات اور اُمنگوں کو خاموش ارتعاش پیدا کرتا ہے اور قاری خود کو افسانے کا کردار محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جناب شہزادہ بسملؔ کو قاری کی توجہ حاصل کرنے اور اُس کے دل میں دلچسپی، تجسس اور اشتیاق کو اُبھارنے کا فن آتا ہے۔

—— ڈاکٹر نذیر مشتاق



